دیدۂ
یعقوب

عرش صدیقی

طبع اوّل

تعداد ایک ہزار

ناشر اے، ایم، خواجہ

کتابت خالد محمود

سرورق موجد

سالِ اشاعت ۱۹۶۶ء

قیمت چار روپے

جدید ناشرین چوک اردو بازار۔ لاہور

انتساب

منزہ کے نام

وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ

الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ۝ قَالُوا تَاللَّهِ تَفْتَأُ تَذْكُرُ يُوسُفَ

حَتَّىٰ تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ ۝

اور الٹا پھرا ان کے پاس سے اور بولا اے افسوس یوسف پر! اور سفید

ہو گئیں آنکھیں اس کی غم سے، سو وہ آپ کو گھونٹ رہا تھا۔ کہنے لگے

قسم اللہ کی تو نہ چھوڑے گا یاد یوسف کی جب تک کہ گل جاوے یا

ہو جاوے مردہ (قرآن حکیم)

اسی مصنف کی دوسری کتابیں

میرزا ادیب کے بہترین افسانے

سب رنگ (انتخاب نظم و نثر)

میرزا ادیب کا فن (زیرِ طبع)

سونا آنگن، افسانے (زیرِ طبع)

منزہ

عرش صدیقی

غزلیں

پیش لفظ

عرش صدیقی کی نظموں، گیتوں، غزلوں کا مجموعہ ——— "دیدۂ یعقوب" میرے پیش نظر ہے۔ میں اگر چاہوں تو بڑے روایتی اور بلند بانگ انداز میں عرش صدیقی کے شاعرانہ کمال کی تعریف میں رطب اللسان ہو سکتا ہوں۔ مثلاً میرے لئے یہ کہنا قطعاً مشکل نہیں کہ عرش ایک سچا شاعر ہے اور اس کے ہاں نہ صرف خلوص کی فراوانی ہے بلکہ وہ اپنے تاثرات کے اظہار و ابلاغ پر قدرت بھی رکھتا ہے۔ پھر میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ عرش کسی خول میں مقید نہیں ہوا، بلکہ اس نے ایک شدید انسان دوستی کے دباؤ کے تحت ذات کی حدود کو پار کر کے کائنات کی کروٹوں کا احاطہ کیا ہے۔ مجھے اس بات کے اظہار میں بھی قطعاً تامل نہیں کہ عرش کے ہاں جذبے اور فکر، داخلیت اور خارجیت کا امتزاج ابھرا ہے۔ اور اس کا کلام ابہام کی دم روکنے والی بوجھل فضا سے ملوث نہیں ہوا، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ تمام بلند بانگ باتیں عرش کی شاعری کے اصل مزاج کو سامنے نہیں لاتیں۔ اس کے لئے سطح سے نیچے جا کر شاعر کی اس نفسی

کیفیت کا جائزہ لینا ضروری ہے جو اس کی شعری توانائی کا اصل باعث ہے۔

اپنی نظموں میں عرش صدیقی کسی "نیم روشن پہاڑی" پر ایستادہ ہے، یہ نیم روشن پہاڑی روشنی اور تاریکی کا ایک سنگم ہے اور شاعر کو منظر کے دونوں رخ دکھا رہی ہے، گویا شاعر کی حیثیت ایک ایسے باشعور انسان کی سی ہے جو دو متضاد کیفیتوں کی زد میں تو آتا ہے، لیکن اپنی ذات کو ریزہ ریزہ ہونے سے صاف بچا لیتا ہے، شاعر نے اپنی اس خاص حیثیت کو نیم روشن پہاڑی کے علاوہ روشندان، چاند کا روزن، دیدۂ یعقوب، ایک دیوانہ "جو تنہائی کی بُکل مارے" راستہ روکے بیٹھا ہے اور منزّہ کے روپ میں دیکھا ہے ـــــــ ایک گہرے کرب اور آبِ گم میں گرتے چلے جانے کے شدید احساس کے باوجود شعور و عرفان کے اس ٹیلے کو دریافت کر کے عرش نے اپنے روحانی سفر کی ایک اہم منزل کی نشان دہی کی ہے، بالعموم جذباتی فشار شاعر کو ایک ایسے اندھے کنوئیں میں گرا دیتا ہے، جہاں سے وہ پھر کبھی باہر نہیں آسکتا اور پوری طرح بیدار ہو جانے کا عمل اسے خارجی زندگی اور اس کے ٹھوس حقائق سے وابستہ کر دیتا ہے، پہلی صورت میں شاعر اپنی ذات میں اس قدر ڈوب جاتا ہے کہ باہر سے اس کا رابطہ قائم ہی نہیں رہتا، بعض جدید علامت پسند شعرا کا حشر یہی ہوا ہے۔ دوسری صورت میں شاعر اپنی ذات سے منقطع ہو کر محض مقصد اور نظریے کے تحت شعر کہتا ہے، دونوں صورتیں تہذیبِ جذبات کی اس خاص کیفیت سے یکسر ناآشنا ہیں جسے ارسطو نے CATHARSIS کا نام دیا ہے، اصل بات تو یہ ہے کہ شاعر اپنے جذبات کے سفر میں اس نیم روشن ٹیلے کو دریافت کرے جو شگفتنِ ذات کا بلند ترین مقام ہے اور جہاں وہ

روشنی اور تاریکی، زندگی اور موت، ماضی اور مستقبل پر ایک تیکھی نظر ڈال سکے۔ یہ نیم روشن ٹیلہ دراصل ایک سیال لمحہ ہے، جو بقول عرشؔ دشمنِ جاں بھی ہے اور ہمراز بھی! اس میں مفاہمت کی چاشنی، نیز نمو کی حرارت بھی ہے اور فنا، خوف اور زوال کا زہر بھی! اور فی الواقعہ یہ وہ موڑ ہے جہاں شاعر کی زندگی کا ایک دور ختم ہُوا اور دوسرے دور نے گھر سے دھندلکوں سے اپنے روشن چہرے کی ایک جھلک دکھائی۔ مثلاً

جہدِ ہستی کے اس بحرِ ظلمات میں
راستوں پر مگر (پیشِ چشمِ نہاں) تیری آنکھوں کے جگنو چمکتے رہے۔

یا

جہاں میں اب ہوں وہاں اگرچہ ہے بیکراں تیرگی فضا میں
مگر یہاں بھی مرے خیالوں میں مہر بن کر ترا سراپا دمک رہا ہے

عرشؔ کی نظموں سے یہ چند ٹکڑے اس "موڑ" کو پوری طرح اجاگر کرتے ہیں

ہوا تھم گئی ہے۔
درختوں پہ اک گہری چپ خیمہ زن ہے۔
ہری گھاس پر چاندنی سو رہی ہے
فضا میں خموشی کی خوشبو بسی ہے
میں اک نیم روشن پہاڑی پہ بیٹھا

درختوں کی وہ چوٹیاں گن رہا ہوں

جو اِک دوسرے سے برابر گریزاں

حسیں رات کی چاندنی ہیں فروزاں

مجھے میری تنہائیِ جان و تن کی

خبر دے رہی ہیں

——— پا بہ زنجیر

صاف محسوس ہوتا ہے کہ "نیم روشن پہاڑی" پر رکنے کا یہ لمحہ دراصل عرفان و انکشاف کا ایک لمحہ ہے اور اس میں شاعر نے اپنی تنہائیِ جان و تن سے آشنا ہونے کے علاوہ درختوں کی چوٹیاں گننے کا بھی آغاز کیا ہے جو اس کی بصارت کے یکایک متحرک ہو جانے کا ایک اہم ثبوت ہے۔ چند اور مثالیں:

لیکن اک لمحۂ سیال کہ جو

دشمنِ جاں بھی ہے ہم راز بھی ہے

چشمِ بے خواب کے دروازے پر

یوں سرِ شام سے استادہ ہے،

جیسے خطرہ ہو اسے شب خوں کا!

——— آدھی رات کا درد

فضا چپ ہے اور نصف شب جا چکی ہے
میں اک فکرِ فردا لیے جاگتا ہوں
مری ننھی بچی ، منزہ ، کہ جس کو
ابھی اس کی امی بہت پیار کرتے ہوئے سوگئی ہے
مجھے میرے ماضی کی قندیل لے کر
کسی آنے والے زمانے کی تصویر دکھلا رہی ہے

______ دعائے نیم شبی

اس بے حد خوبصورت نظم میں شاعر نے اپنی پیاری بچی کو ایک ایسے آئینے کے روپ میں دیکھا ہے جس میں شاعر کا ماضی اور مستقبل دونوں منعکس ہو رہے ہیں، گویا منزہ بھی نیم روشن پہاڑی کی طرح شاعر کی احساسی اور روحانی دنیا کا ایک ارفع مقام ہے۔ یہ ایک ایسا سیال لمحہ ہے جسے شاعر کے بے پناہ کرب نے جنم دیا ہے اور جو اب اس کرب کا مداوا بن گیا ہے:

فرشِ پرِ افشاں و خیزاں پھیکی پھیکی روشنی
وسعتِ عالم سے ترساں سہمی سہمی زندگی
سایہ افگن بام و در پر شامیانے درد کے
اور ذہنِ شہرِ رخشاں چائے کی پیالی میں گم
چائے کی پیالی میں گم تصویرِ حسنِ یار بھی

جذبۂ ذوقِ طلب بھی

شوخیٔ گفتار بھی

شعلۂ سوزِ دروں بھی

عقل کی تلوار بھی !

ـــــــ ارتقاء کا ایک تاریک موڑ۔

شاعر کو چاسے کی پیالی میں ارتقا کا ایک تاریک موڑ نظر آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی پیالی جامِ جہاں نما بن گئی ہے اور اس ایک آئینے میں شاعر نے زندگی کی بیشتر کروٹوں کو منعکس دیکھا ہے۔ یہ کروٹیں محض حال کے لمحے سے وابستہ نہیں، بلکہ بیتے ہوتے واقعات کے علاوہ آنے والے زمانوں سے بھی آشنا ہیں، یہی چمکتا ہوا لمحہ شاعر کے کلام میں متعدد روپ دھار کر برآمد ہوا ہے اور یہی اس کے طویل کرب کا لذیذ ترین ثمر بھی ہے۔

دنیا محوِ خوابِ گراں ہے، ہر جانب خاموشی ہے

ہاتھ میں پتھر لے کر نکلو شاید کوئی دیوانہ

تنہائی کی بجلی مارے، راستہ روکے بیٹھا ہو

ـــــــ ہاتھ میں پتھر لے کر نکلو

اندھیرے کا تسلط تھا زمیں پر

کھلا گر چاند کا روزن نہ ہوتا،

میں اپنے بند کمرے میں پڑا ہوں ،
نہ کھڑکی میں کوئی منظر نہ دَر میں ،
مگر ننھا سا روشندان گویا
مثالِ چشمِ حیراں دیکھتا ہے
کہ باہر کس طرح بادِ زمستاں
غبارِ کہر سے زور آزما ہے

——— روزن

مندرجہ بالا نظموں میں سے مقدم الذکر میں "سیّال لمحے" نے ایک دیوانے کا رُوپ دھارا ہے اور یہ دیوانہ دراصل ہزار فرزانوں سے زیادہ باشعور ہے ——— دیوانہ، شاعر کا ہمزاد ہے اور اس کی نئی نویلی انفرادیت کی ایک اہم علامت! جب دنیا محوِ خواب گراں ہوتی ہے اور انسان عادت اور تکرار کی لکیر پر ایک مشین کی طرح بڑھتے چلا جاتا ہے، یعنی جب وہ اُس بصارت سے ناآشنا ہوتا ہے جس کے بغیر زندگی کے المیئے کا احساس ناممکن ہے تو عین اُس سمے بکیراں تیرگی میں روشنی کا ایک کوندا سا لپکتا ہے ——— یہ روشنی بظاہر دیوانگی کی ایک علامت ہے، کیونکہ اسے عام ڈگر پر چلتی ہوئی میکانکی زندگی کی کسی قدر پر بھی اعتماد نہیں لیکن دراصل یہ آنیوالے دَور کی نقیب ہے اس میں بے پناہ امکانات مضمر ہیں نہ صرف ہر فرد بلکہ ہر معاشرہ کے بطن میں زود یا بدیر یہ روشنی ضرور نمودار ہوتی ہے ورنہ فرد اور معاشرہ دونوں کا ذہنی اور روحانی ارتقا ختم ہو کر رہ جاتے ——— عرش صدیقی نے اس روشنی کو تین پَرتوں میں دیکھا ہے

اوّل یوں کہ اس کے سامنے ایک ٹیلہ اُبھر آیا ہے ـــــ ٹیلہ جو روشنی اور تاریکی کا سنگم ہے واضح رہے کہ اس ٹیلے میں تلمیح کی ساری توانائی اور حُسن موجود ہے اور اس کے ذکر سے قاری کا ذہن طُور کی روشنی کی طرف فی الفور منتقل ہوجاتا ہے۔ تاریخِ تہذیب میں طُور کا واقعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ انسان کے حیوانی سطح سے اوپر اٹھ کر روح کی روشنی سے آشنا ہونے کے مرحلہ کو بیان کرتا ہے، دوم اس طرح کہ وقت کا تعین کرتے ہوئے شاعر نے آدھی رات کا بار بار ذکر کیا ہے اور آدھی رات بجائے خود روشنی اور تاریکی کا ایک سنگم ہے، گویا شاعر نے نیم روشن ٹیلے کے پس منظر میں وقت کی ایک مماثل کیفیت کو لا کھڑا کیا ہے اور یوں منظر میں ایک نئی سطح کا اضافہ کر دیا ہے آخری یوں کہ عرش نے اس ٹیلے کے پس منظر میں فرد کی ابصارت کے یکایک متحرک ہونے کی کہانی کو ایک واضح کردار میں متشکل کر کے دکھایا ہے، یہ کردار ایک "دیوانہ" ہے، جو روشنی کی علامت بن کر فرد کے راستے میں آ بیٹھا ہے اور جو منصور، قیس یا ابنِ مریم کی طرح فرد کی برہمی، جھلاہٹ اور ظلم کا نشانہ تو بنتا ہے تاہم حس کا ظرف کشادہ، دل توانا اور ارادہ مستحکم ہے۔ چنانچہ وہ "پتھراؤ" کے عمل کو خندۂ استہزا میں اڑاتا ہے:۔

"تم اس پر پتھراؤ کرو
پتھر کھا کر ہنس دے گا وہ
سمجھے گا دیوانہ ہے ـــــ
درد سے یہ بے حال ہے، اس کا دل غم کا پیمانہ ہے"

اور وہ تم سے کچھ نہ کہے گا

راہ سے ہٹ کر بیٹھ رہے گا

دوسری نظم میں "سیال لمحے" نے ایک "روزن" کا روپ دھارا ہے، یہ روزن اندھی اور تاریک کائنات میں چاند بن کر اور ایک تاریک کمرے میں "روشندان" بن کر نمودار ہوتا ہے، تاہم ان علامتی مظاہر کے پس منظر میں یہ انسانی بصارت کے متحرک ہونے ہی کی نشان دہی کرتا ہے، خود شاعر نے اسے کمرے کی آنکھ قرار دیا ہے، چونکہ علامتی زبان میں کمرا خود شاعر کی ذات کا مظہر ہے اس لئے روزن سے شاعر کی مراد خود آگاہی کی وہ کیفیت ہے جو ہمیشہ تاریکیوں کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔

بہرکیف "سیال لمحہ" چاہے دلوائے کے روپ میں ابھرے یا ایک روزن میں منتقل کر نمودار ہو اسکی اہم ترین صفت "بینائی" ہے۔ گویا یہ لمحہ نہیں بلکہ ایک چشم بینا ہے جو یکایک بیدار ہو کر زندگی کے دونوں ادوار کو دیکھنے لگی ہے۔ شاعر نے تلمیحات کی زبان میں چشم بینا کو "دیدۂ یعقوب" سے تشبیہ دی ہے اور یوں نیم روشن پہاڑی پر ایستادہ ہونے کی ساری نفسیاتی کیفیات کو بڑی خوبصورتی سے بے نقاب کر دیا ہے۔ "دیدۂ یعقوب" بیک وقت کرب اور عرفان کی علامت ہے، اس میں آنسوؤں کا ایک ایسا سیلاب آ چکا ہے کہ اب یہ سفید کاغذ کی طرح بیداغ ہے، لیکن بیداغ ہونے پر اس میں وہ داخلی بصیرت اور روشنی بھی ابھر آئی ہے، جسے عارفوں اور ویدانتیوں نے عرفان ذات کے سلسلے میں ہمیشہ بڑی اہمیت دی ہے۔ جوش صدیقی کے ہاں جذباتی فشار کے عین

درمیان اس سیّال لمحے کی نمود نے اس کی نظموں میں نہ صرف ایک خوشگوار روشنی بکھیر دی ہے بلکہ روحانی تگ و تاز کے لئے ایک وسیع میدان بھی مہیّا کر دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر وِش نے روح کی اس جہت کو اختیار کئے رکھا تو اس کے فن میں رفعت اور سندرتا اسی طرح برقرار رہے گی۔

وزیر آغا

چاہِ بیاباں

نظمیں

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ
وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ
بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝

(بولا ایک بولنے والا ان میں، مت مارو یوسف کو اور پھینک دو اس کو گمنام
کنوئیں میں کہ اٹھا لے جائے اس کو کوئی مسافر اگر تم کو کرنا ہے (قرآن حکیم)

ہے وہی چاہِ بیاباں زندگی کہہ لیں جسے

زندگی ہر دم عتابِ تازہ کا عنواں لئے

زندگی دشنہ لئے خنجر لئے پیکاں لئے

دعائے نیم شبی

فضا چپ ہے اور نصف شب جا چکی ہے
میں اک فکرِ فردا لئے جاگتا ہوں
مری ننھی بچی منزّہ[۱]، کہ جس کو
ابھی اس کی امّی بہت پیار کرتے ہوتے سوگئی ہے
مجھے، میرے ماضی کی قندیل لے کر
کسی آنے والے زمانے کی تصویر دکھلا رہی ہے!

○

---

۱ منزہ، سوا پانچ سال کی عمر میں ۱۴؍اکتوبر ۱۹۶۴ء کو انتقال کر گئی، اس نظم کی تخلیق کے وقت اس کی عمر تقریباً ½۳ برس تھی

مجھے یاد ہے اک برس اس کے آنے سے پہلے
مجھے اس کی امی سے کوئی تعلق کوئی واسطہ تک نہیں تھا
میں اس کے لیے غیر تھا، اجنبی تھا
مگر ایک سیال لمحے نے اُس کو
اسی اجنبی کی، اسی غیر کی ہر خوشی کا خدا کر دیا تھا
میں اِک اجنبی دُور سے آنے والا
وہ اک دوسرے شہر کی رہنے والی
نہ میں نے اسے تپتے صحرا میں ڈھونڈا
نہ اس نے مجھے میٹھے سپنوں میں دیکھا
مگر ہم نے اک دوسرے کی نظر میں
سکون و محبت کا وہ راز پایا
کہ ہم اپنے بختِ رسا پر ہیں نازاں!

O

مری ننھی بچی، منزہ، کہ جس کو
ابھی اس کی امی
بہت پیار کرتے ہوتے سو گئی ہے

مجھے، میرے ماضی کی قندیل لے کر
کسی آنے والے زمانے کی تصویر دکھلا رہی ہے

کہ ہو کر جواں جب
وہ امی کے حسنِ سکوں بخش کی یاد تازہ کرے گی
تو اک اجنبی جانے کس شہر سے کون سے راستے سے
سجاتے ہوئے اپنے ماتھے پہ تاروں کا سہرا
لئے ہاتھ میں تازہ پھولوں کا گجرا
مرے پاس آئے گا اپنے مقدر کا زور آزمانے
میں اس کی خوشی کے لئے زندگی کے اثاثے کو قرباں کروں گا
وہ ہنستا ہوا، مسکراتا ہوا، میری تسکینِ جاں کو
مرے لختِ دل کو مرے مرکزِ آرزو کو
نہ جانے کہاں، کونسے دیس کی کونسی وادیوں میں مقید کرے گا
میں اس آنے والے زمانے کی تصویر ہر شب
دریچوں میں، کمروں میں، صحنوں میں سجتی ہوئی دیکھتا ہوں
اور اپنے خدا سے
(مرا ہو کے مجھ سے جدا رہنے والے خدا سے [1]
فقط اک دعا — ایک ننھی دعا مانگتا ہوں
کہ اس اجنبی کا بھی میرا سا دل ہو!!

---

[1] اس مصرعے کا اضافہ مزہ کی وفات کے بعد ہوا

رشتۂ دل

خالقِ سوزِ وفا!

مجھ سے دامن نہ چھڑا!!

میں ترے خنجرِ ابرو کا قتیل،

حلقۂ گیسوئے پیچاں کا اسیر،

خانۂ چشمِ غزالیں کا مکیں،

مجھ کو معلوم نہیں

جُز ترے اور بھی ہے کوئی خُدا!!

جُز مرے اور بھی ہے کوئی نبی!!

پا بہ زنجیر

ہوا تھم گئی ہے

درختوں پہ اک گہری چپ خیمہ زن ہے

ہری گھاس پر چاندنی سو رہی ہے

فضا میں خموشی کی خوشبو بسی ہے

میں اک نیم روشن پہاڑی پہ بیٹھا

درختوں کی وہ چوٹیاں گن رہا ہوں

جو اک دوسرے سے برابر گریزاں
حسیں رات کی چاندنی میں فروزاں
مجھے، میری تنہائیِ جان و تن کی
خبر دے رہی ہیں!
اُدھر، سامنے، ایک خاموش میداں
فضاؤں کے ہمدوش پھیلا ہوا ہے
اِدھر پُشت پر کوہساروں کی دنیا
افق تا افق آسماں تک گئی ہے!
میں اپنی پہاڑی کی چوٹی پہ بیٹھا
نگاہیں جھکاتے ہوئے سوچتا ہوں
کہ ان آسمانوں،
کہ ان کوہساروں،
کہ ان مرغزاروں میں کیا شے ہے میری!
مجھے سب خبر ہے
مرا کچھ نہیں ہے!
نہ کہسار میرے،

نہ میدان میرا،
فقط نیم روشن پہاڑی ہے میری!
ازل سے میں اس برجِ کاگیشیا کا
پرومی تھیئس ہوں!

○

پہاڑوں کے اس پار ہے ایک وادی
جسے میں تخیل کی آنکھوں سے اکثر
سجا دیکھتا ہوں!
کبھی میں وہیں تھا
مگر اب پہاڑوں کا وہ سلسلہ درمیاں ہے
جو دوروں کے ہر طور امکاں مٹاتے
گراں تا گراں آسماں تک گیا ہے!
مرے سامنے ہے جو خاموش میداں
یہاں بھی کئی بار محفل سجی ہے،
کئی بار اٹھے ہیں نغمے یہاں سے
وہ نغمے کہ جن سے جواں زندگی ہے

کئی بار اس نے پکارا ہے مجھ کو

کئی بار میں نے بھی آواز دی ہے

مگر میں ہوں اپنی پہاڑی کا قیدی

(اُدھر دشتِ فردا، اِدھر کوہِ ماضی)

یہ سب دُور ہی دُور سے دیکھتا ہوں!

آدھی رات کا درد

نصفِ شب بیت چکی ہے لیکن،
نیند شاید مری قسمت میں نہیں!

○

دور تک پھیلی ہوئی خاموشی
بیکراں رات کے گہرے سائے
صبحِ تاباں کی بشارت دے کر
اک دلِ زار کو بہلاتے تو ہیں

لیکن اِک لمحۂ سیّال کہ جو
دشمنِ جاں بھی ہے ہمراز بھی ہے
چشمِ بے خواب کے دروازے پر
یوں سرِ شام سے استادہ ہے
جیسے خطرہ ہو اسے شب خوں کا!

○

آنکھیں کھولے ہوتے خاموش نجوم
پوچھتے ہیں کہ ہراساں کیوں ہو،
تیرگی باعثِ تشویش ہے کیوں،
یہ تو شب بھر کے لئے آتی ہے
صبح آتے، تو چلی جاتے گی!

○

وحشتِ فرداکی ہے وہ طُرفہ چبھن
ذہن آوارہ ہوا جاتا ہے
کربِ دُوری سے مٹا جاتا ہے
میرے اعصاب پہ ہے خوف سوار

رات اگر یونہی گزر جائے گی
نیند اِن آنکھوں میں کب آئے گی!

○

تیرگی کہتی ہے — آنکھیں مونْدو
فکرِ فردا نہ کرو، سو جاؤ
نصف شب بیت چکی ہے، دیکھو،
اور باقی ہے جو، وہ بھی آخر
وقت آئے گا گزر جائے گی
اور پھر نورِ سحر آئے گی
نیند لیکن مری قسمت میں نہیں!

○

دل کو دُکھڑا ہے کہیں آخرِ شب
نیند مانندِ ہوائے گلشن
لے کے مرہم نہ چلی آئے یہاں
اور میں شہرِ گراں خواب میں گم
بے نیازِ سحر و شام کہیں،

وقفِ مئے خانۂ آرام رہوں
لذتِ رونقِ آغازِ سحر
ایک لمحے کے لئے پا نہ سکوں
فکرِ فردا سے سبکدوش ہو دل
دردِ ماضی کی خلش مٹ جاتے
حال اک لحظہ بیگانہ بنے۔
پھر سحر آئے تو کیا مجھ سے غرض
ایسے انجام سے بیزار ہوں میں!
نصف شب بیت چکی ہے اے دل
وقت سونے کا یہی ہے لیکن
نیند امشب مری قسمت میں نہیں!

ارتقا کا ایک تاریک موڑ

فرش پر افشاں و خیزاں پھیکی پھیکی روشنی
وسعتِ عالم سے ترساں سہمی سہمی زندگی
سایہ افگن بام و دَر پر شامیانے دَرد کے
اور ذہنِ شہرِ زرفشاں چائے کی پیالی میں گُم!

○

چائے کی پیالی میں گُم تصویرِ حسنِ یار بھی
جذبۂ ذوقِ طلب بھی

شوخیٔ گفتار بھی

شعلۂ سوزِ دروں بھی

عقل کی تلوار بھی!

فلسفہ، سائنس، تصوف، شاعری، مذہب، خدا

سب مری بے چارگی کے سامنے معذور محض

عشق اک کمرے کی دیواروں کے اندر منجمد

زندگی کاغذ کے انباروں کے نیچے نیم جاں

حسن سڑکوں پر غزل خواں

دور ویرانوں میں رقصاں

دشت میں صحرا میں حیراں

عشق کی کم مائیگی سے

ذہن کی بے چارگی سے

علم کی افتادگی سے

بے خبر!

آبِ گُم کا سفر

غروبِ آفتاب اور سانتے ڈھلتی شام کے
روش روش سے لمحہ لمحہ واپسی حیات کی
لہکتے گاتے کھیت شب کے خوف سے فسردہ رُو
خموشیوں کے دشت میں مویشیوں کے قافلے
فسردہ دل تھکے ہوتے
اور ان کے پیچھے چند سادہ نوجوان
تمام دن کی سختیوں کی دھول میں اَٹے ہوتے!

طیورِ نغمہ بار کے حیات بخش چہچہے
افق سے اٹھنے والی تیرگی میں گم!

○

طلوعِ آفتاب اور پھر وہ کل سا بانکپن
حیات کا حسیں چلن!

○

طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب اور طلوعِ آفتاب پھر
مرا یہ سلسلہ نہیں
مری حیاتِ مختصر
ہے آبِ گُم کا اِک سفر
مرے سفر کی اک سحر
مرے سفر کی ایک شام
اور اس کے بعد مستقل
زمیں کی گود میں ابد کی تیرگی
پرانے مقبروں کی گہری خامشی!

سہارے

جونہی آثارِ نورِ سحر مشرقِ جہدِ جہاں پہ ہویدا ہوئے
میں تگ و تازِ ہستی میں گم ہوگیا
اور مرے اور ترے درمیاں فاصلے بڑھ گئے !

○

یونہی ہر صبحِ تازہ ہمارے لئے
(گو کہ مادی سہاروں کا ساماں بنی)
لائی دکھ بے اماں، ہجرِ جانکاہ کے !

○

Scanned with CamScanner

ہم کہ وقفِ شبستانِ آرام تھے

چاہتے تھے کہ یونہی زمانوں کو لمحے بناتے رہیں

رشتۂ جسم و جاں کے تقاضوں سے پسپا ہوتے!

○

جاگتا شہر ہنگامۂ زیست کے کل عناصر لئے

ایک مہجور دل کے لئے وحشتِ غربت بنا

لیکن اس روشنی کے بیاباں میں بھی اک غزالِ وفا نے سہارے دیئے!

○

ہر نفس گو یہاں کار ہائے جہاں جال بُنتے رہے

کان میرے مگر تیری آواز کے

خوشنما، جانفزا پھول چُنتے رہے!

○

زیرِ بارِ جہاں گو کہ دن بھر یہاں معدنِ دل میں ارماں سسکتے رہے

جہدِ ہستی کے اِس بحرِ ظلمات میں

راستوں پہ مگر دیپ، پیشِ چشمِ نہاں، تیری آنکھوں کے جگنو چمکتے رہے!

نارسائی

نزہتِ شام نے جب رختِ سفر باندھ لیا
درد نے روح کو بیداری کا پیغام دیا!
آہ ناسورِ وفا!!
گھر سے ہم، عشرتِ آزار کے شیدا نکلے
ہو کے جاں سوزیٔ تنہائی سے پسپا نکلے
لے کے اپنے دلِ بیمار کو تنہا نکلے!
سوچ رکھا تھا کہ اب یوں اسے بہلائیں گے

رقص میں، مے میں، کسی ساز میں کھو جائیں گے
ہوش سے آج تو محروم سے ہو جائیں گے
تاکہ جاں حسنِ تمنّا کے فسوں سے چھوٹے
مصلحت کوش بنے قیدِ جنوں سے چھوٹے
سر سے دلداریٔ آزار کا سودا نکلے
ورنہ مٹ جائے تیری یاد کا کانٹا نکلے!
لیکن اس شومیٔ تقدیر کا کیا ہو شکوہ
سر ہی جب نازکیٔ وار سے اونچا نکلے!!

ہاتھ میں پتھر لے کر نکلو

دنیا محوِ خوابِ گراں ہے، ہر جانب خاموشی ہے

ہاتھ میں پتھر لے کر نکلو ـــــ شاید کوئی دیوانہ

تنہائی کی بُکّل مارے، راستہ روکے بیٹھا ہو

تم کو آتا دیکھ کے پوچھے :

"کون ہو؟ اتنی رات گئے کیوں گھر سے باہر پھرتے ہو؟"

شاید تم کہنا چاہو گے :

"یہ پچھر دیکھ کے آیا ہوں"

شاید سمجھانا چاہو گے

"آپ کا میں ہمسایہ ہوں"
لیکن تم کچھ کہہ نہ سکو گے، لرزو گے، گھبراؤ گے
اور وہ دیوانہ سمجھے گا ــــــ یہ کوئی فرزانہ ہے
خوش ہو کر وہ پاس آئے گا
ہاتھ پکڑ کر تم سے کہے گا:
"آؤ جفا کی رسمیں توڑیں
آؤ وفا کی بات کریں
آؤ جنوں کا دامن تھامیں
آؤ فضا میں رنگ بھریں
زہر ہے شہر کی دیواروں میں
آؤ ان سے دور چلیں
عالم سب ویران پڑا ہے
آؤ اسے گلزار کریں
آؤ جئیں آزاد فضا میں
صحراؤں کے راگنیں
آؤ ایسا باغ سجائیں

جس میں سُکھ کے پھول کھلیں"

تم سوچو گے "دیوانہ ہے، بہکی باتیں کرتا ہے"

اور چپا ہو گے۔ اس سے کہہ دو:

"جلدی میں ہوں چھوڑو بھی

گھر میں میرے بیوی بچے

دیر سے تنہا بیٹھے ہیں"

لیکن تم کچھ کہہ نہ سکو گے لرزو گے گھبراؤ گے

تم سوچو گے وہ پوچھے گا:

"تم کیوں بیوی بچوں کو یوں تنہا چھوڑ کے آتے ہو؟"

اور چپا ہو گے کہہ دیتا ہوں:

"میں کوتی ان کا نوکر ہوں!"

لیکن تم کچھ نہ کہہ سکو گے لرزو گے گھبراؤ گے

پھر سوچو گے "آج اگر اس دیوانے سے

بچ نکلوں تو کل اس راہ نہ آؤں گا"

لیکن اُس آسیب کی آنکھیں

یہ کہہ کر دھمکائیں گی:

"تم جو راہ بھی اپناؤ گے اس پر ہم کو پاؤ گے"!

چاہتے ہو گر اس سے بچنا

رات کی تنہا راہوں میں

ہاتھ میں پتھر لے کر نکلو

اور جیبوں میں سنگ بھرو

وہ جب آئے تمہاری جانب

تم اُس پر پتھراؤ کرو

پتھر کھا کر ہنس دے گا وہ

سمجھے گا "دیوانہ ہے —

درد سے یہ بے حال ہے، اس کا دل غم کا پیمانہ ہے"!

اور وہ تم سے کچھ نہ کہے گا

راہ سے ہٹ کر بیٹھ رہے گا!

○

دنیا محوِ خواب گراں ہے، ہر جانب خاموشی ہے

ہاتھ میں پتھر لے کر نکلو ورنہ تم پچھتاؤ گے!

روزن

اندھیرے کا تسلط تھا زمیں پر
کھُلا گر چاند کا روزن نہ ہوتا

○

میں اپنے بند کمرے میں پڑا ہوں
نہ کھڑکی میں کوئی منظر نہ در میں
مگر ننھا سا روشندان گویا
مثالِ چشمِ حیراں دیکھتا ہے

کہ باہر کِس طرح ماہِ زمستاں

غبارِ کہر سے زور آزما ہے

○

مرے ننھّے سے روشندان کی راہ

غبارِ کہر تے رو کی ہوتی ہے

مگر ہر پَل مرے کمرے کے اندر

فضا میں، فرش پر، دیوار و دَر پر

ہے عکسِ عالمِ مہتاب لرزاں

یہ روزن آنکھ ہے کمرے کی اس سے

میں باہر کا تماشا دیکھتا ہوں

○

گھٹن سینے میں ہے اُس دَرد کی جو،

نہ گھٹتا ہے نہ بڑھ کر پُھوٹتا ہے

اندھیرے کا ہے اک احساس ہر دم

مگر یہ دل کہ اک روزن ہے یہ بھی

جہانِ رنگ و بو کو، روشنی کو؛

مثالِ چشمِ حیراں دیکھتا ہے

○

اندھیرے کا تسلط تھا زمیں پر
کھلا گر دِل کا یہ روزن نہ ہوتا

———

اے جادوگر

اے جادوگر پاس ترے کیا ایسا بھی کوئی جادو ہے

مجھ کو جو اک دم پنکھ لگا دے اور کیلاش پہ پہنچا دے

ساتھ میں اپنے گھور اندھیرے اس دنیا کے لے جاؤں

اور کیلاش پہ برساؤں

پاربتی کو سیس نواؤں اور شوجی سے یہ پوچھوں

تم جو یہاں کیلاش پہ بیٹھے امرت[1] جام چڑھاتے ہو

---

[1] امرت کے ذائقے سے واقف ہونے کا اعتراف شوجی نے خود کیا ہے. ظاہر ہے وہ امرت پیتے تھے. یہ اس لئے بھی درست ہے کہ امرت تمام دیوتاؤں کا مشروب تھا.

اور تاروں کی قندیلوں سے اپنا سورگ سجاتے ہو

کوئی تمہیں دکھ درد نہیں تم ہر دم عیش مناتے ہو

گیت خوشی کے گاتے ہو

اور اس دھرتی کے پرشوں کو وعدوں سے بہلاتے ہو

ہر دل کو ترساتے ہو!

تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے دھرتی پر کیا ہوتا ہے؟

کیوں اس کا قسمہ سوتا ہے؟

اس دھرتی کو دیکھو جو ہے ایک پہیلی ایک سوال

ہر ہر دے اک اگنی کنڈ ہر آنکھ یہاں اک نینی تال

ہم سے اتنی دُور ہے اُوشا جتنا سورج سے پاتال

پل بھر کو ملتی ہے خوشی اور باقی برسوں کا جنجال!

کس برتے پر کہلاتے ہو شو جی تم جگ پال[1]

---

[1] شو جی کو عموماً جگ کا وناش کرنے والا مانا گیا ہے۔ لیکن تخلیق کے عمل کی پیچیدگیوں پر غور کرنے والوں نے اسے جگ پال بھی سمجھا ہے۔ کیونکہ اس نے سمندر کا زہر پی کر کائنات کو تباہی سے بچایا یوں وہ تباہی اور موت کے ذریعے تخلیق کے عمل کو جاری رکھنے اور کائنات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔

روح کی باتیں سب کرتے ہیں کوئی نہیں ودوان
کوئی نہیں جو ہم کو بتاتے ملتا ہے کیسے بھگوان
مذہب ایسا خول بنا ہے جیسے مورت مندر کی
اوپر سے پیاری پیاری
اور اندر سے خالی سی!
تم بتلاؤ نام پہ اپنے جب مندر بنواتے ہو
اس میں اک پتھر رکھوا کر خود کیوں گم ہو جاتے ہو؟

○

اے جادوگر پاس ترے کیا ایسا بھی کوئی جادو ہے
مجھ سے جو میرا اور بنا کر اس دھرتی پہ بکھرا دے؟
غم کے ان بیجوں کی دھرتی کچھ عرصہ رکھوالی ہو
اور پھر بھرے ایسی برکھا پگ پگ پر ہریالی ہو
ہر غم کی پامالی ہو!
یا پھر مجھ سے میں چھن جاؤں میری سوچ ہی لٹ جائے
پھر نہ مجھے اپنا ہی دکھ ہو اور نہ ہو غم دنیا کا
دھرتی پہ ہو گھور اندھیرا

اور میں بے پرواسوؤں

رشو جی امرت جام چڑھائیں چین کی مُرلی بجائیں
سب کچھ دیکھوں کچھ بھی نہ سمجھوں خود میں گم ہو جاؤں!
اے جادوگر پاس ترے کیا ایسا بھی کوئی جادو ہے ؟

Scanned with CamScanner

میں بھٹکتا ہوں قریب آ

جب سے میں نے ترے ہونٹوں سے وہ صہبا پی ہے

جس کے ہر گھونٹ میں تلخی بھی ہے شیرینی بھی

میں سکوں نام کی ہر چیز گنوا بیٹھا ہوں!

بدگماں ہیں مری صبحیں، مری شامیں مجھ سے

میری نیندیں مری راتوں سے خفا رہتی ہیں!

میرے دن رات میں اب فرق نہیں ہے کچھ بھی

شدتِ کرب نے چھینا ہے قرارِ ہستی
خرمنِ زیست غم و درد کی آتش میں تپاں ہے
نہ سکوں ہے نہ اماں ہے!

○

دل پریشان ہے کہ حل کر یہ بچھڑنا کیوں ہے!
کاش تو میری نگاہوں کے قریں رہ سکتی
تیری قربت مری ہستی کا سکوں بن جاتی
تیرے لب میرے دل و جاں کو سناکر نغمے
تجھ کو خوابوں کے حسیں دیس میں دائم رکھتے
اور میں ساتے ہیں زلفوں کے تری سورہتا!

○

میرا دل اور مری روح ــــــ سکوں کے طالب
کر رہے ہیں غم دوری کی شکایت تجھ سے
آ. قریب آ. غم دوری کو مٹا دے آکر
میں کہاں ہوں مجھے یہ راز بتادے آکر
اپنے بوسے مرے ہونٹوں سے تو واپس لے لے

اور مجھے تیرے لبوں سے جو ملی تھی لوری

اس کو پھر اپنا پتہ دے!

میری صبحیں، مری شامیں جو خدا جانے کہاں ہیں

میری نیندیں جو ہر اک رات کی آنکھوں سے نہاں ہیں

مجھے پھر لوٹا دے!

میں بھٹکتا ہوں قریب آ

میری منزل، میری دنیا،

مجھے منزل کا پتہ دے!!

بازگشت

————:لاجو کے نام:————

میں تیری بستی سے بھاگ کر دور اک خرابے میں آگیا ہوں

یہ وہ خرابہ ہے جس میں ہستی کی روشنی کا گزر نہیں ہے

یہاں نہ تو ہے نہ رنگ و بو ہے نہ زندگی ہے

یہاں ہے وہ عالمِ خموشی کہ دل کی دھڑکن بھی بے صدا ہے

کہ میری تنہائیوں کے دامن افق کے دامن سے جا ملے ہیں !

ترے نگر کے حسین کوچے، شفیق گلیاں جو زیست کی روشنی کا گھر ہیں

مرے لئے میری بے بسی نے انہیں شب آلود کر دیا ہے !

وہ رہگذر تیرے نقشِ پا پر جہاں ہزار آستاں بنے ہیں
وہ رہگذر اجنبی ہوئے ہیں!

○

جہاں میں اب ہوں وہاں اگرچہ ہے بیکراں تیرگی فضا میں
مگر یہاں بھی مرے خیالوں میں مہر بن کر ترا سراپا دمک رہا ہے
ہوا کے بے کیف سرد جھونکے جو زرد پتوں سے کھیلتے ہیں
تو میری بے آب خشک آنکھیں تجھے خلاؤں میں ڈھونڈتی ہیں
مرا تخیل ـــ کہ اس خرابے سے بدگماں ہے ـــ
مرے حسوں کو جھنجھوڑتا ہے تو سوچتا ہوں:
اگرچہ تو ایک وہ حقیقت ہے جس کا اقرار لابدی ہے
مگر یہ تیرا وجود میرے لئے فقط ایک واہمہ ہے
کہ تیری زلفوں کو میرے شانوں نے اپنی دنیا سے دور پایا
کہ میرے اشکوں کو تیرے دامن کی آرزو ہی رہی ہمیشہ!
مگر میں خوش تھا
کہ میرے غم نے ترے تخیل میں وہ ستارے سے بھر دیئے تھے
چراغ جن کے نہ بجھ سکے ہیں نہ بجھ سکیں گے!

یہ سب تھا لیکن جنوں پہ کچھ ایسی قدغنیں تھیں
کہ جذبِ دل حرفِ مدعا کو نہ پا سکا تھا
کبھی کوئی درد لفظ بن کر مری زباں پر نہ آسکا تھا!
مگر نہ جانے وہ کیا تھا جس نے دلوں کے پردے اٹھا دیئے تھے
جنوں کے اسرار وا کئے تھے!
تہی زباں ہم ہوتے تھے لیکن زباں کے محتاج کب رہے تھے
کہ ہم نگاہوں سے دل کے پیغام بھیجتے تھے!
یہ سب تھا لیکن میں کربِ جاں سوز کا امیں تھا
وہ کربِ جاں سوز تھا کہ میری حیات سے نیند بدگماں تھی ـــ
اور اس خرابے میں جس میں ہستی کی روشنی کا گذر نہیں ہے
جہاں نہ تو ہے نہ رنگ و بُو ہے نہ زندگی ہے
مرا گماں تھا یہاں تجھے خود سے دور پا کر میں کرب سے جاں بچا سکوں گا
تجھے کبھی تو دماغ و دل سے ہٹا سکوں گا
تجھے کبھی تو بھلا سکوں گا
مگر یہ اک اور واہمہ تھا!
قیامتیں سوزِ درد دل میں نہاں وہی ہیں

عبث غمِ زندگی سے میں نے فرار چاہا
اسی طرح کربِ جاں گزا سے میں اب بھی آتش بجاں ہوں ہر دم
کہ اب ترا شہر چھوڑنے کا اک اور غم ہے!
اگرچہ تیرا وجود میرے لئے فقط ایک واہمہ تھا
اگرچہ تیرا وجود میرے لئے فقط ایک واہمہ ہے
مگر ترا پیکرِ مثالی مرے خیالوں میں جاگزیں ہے
کہ وہ کسی دلکشا حقیقت کا بھی امیں ہے!
اور اس سے مجھ کو مفر نہیں ہے!!

○

میں سوچتا ہوں کہ اس خرابے سے لوٹ جاؤں
جہاں نہ تو ہے، نہ رنگ و بو ہے نہ زندگی ہے
جہاں مجھے آج یہ بھی غم ہے
کہ میں نے شہرِ حبیب چھوڑا
وفا سے میں نے وفا نہیں کی!
میں سوچتا ہوں کہ اس خرابے سے لوٹ جاؤں
وہیں — جہاں میں نے زندگی کا سکون ڈھونڈا

گھر نہ پایا

وہیں جہاں میں نے روشنی کے سراب دیکھے

حقیقتوں پر نقاب دیکھے

وہیں جہاں میں نے راحتوں کے حباب دیکھے

وہیں ملے گا سکوں اگر مجھ کو زندگی میں کہیں ملے گا!

○

مگر یہ اک خوف میرا دامن اسی خرابے سے باندھتا ہے

کہ اُس جگہ پھر اگر جنوں نے سکوں نہ پایا تو کیا کروں گا!!

عشق

خوشی ملی ہے مگر ایک بے کلی سی ہے
تو مل گیا ہے مگر اب بھی کچھ کمی سی ہے
یہ تیرا حُسن ترا نور تیرا رنگِ جمال
مہک یہ تیری ترا رقص تیری چال کا جال
یہ شام زُلف یہ چہرے کا آفتابِ سحر
مرا فسوں تھا مرا پرتو نظر تھا مگر
نہ مجھ کو اس کی خبر تھی نہ تھا مجھے معلوم

یہ میں بھی میں تھا اگرچہ تھا نقطۂ موہوم
اگر ہٹ تو مری منزل تو پھر کمی کیسی!
کھلا یہ راز مجھے تیری جستجو ہی سے بھی!!
ازل سے اپنی ہی تصویر کا میں عاشق تھا
ازل سے تھا مجھے اپنے ہی حُسن کا سودا!
مجھے تھا اپنی ہی تکمیل کا ازل سے جنوں
غلط غلط کہ میں ہوں کوئی تیرا جیسا زبوں!

سہاگن کا گیت

سُن ری ہم جولی، منوا کی بولی
پہنچی جب دوسرے دیس ڈولی
شام ہوتے پیا گھنشیام آتے
میٹھی باتوں کی سوغات لاتے
پیار انمول دل میں بساتے
مجھ سے کرتے رہے وہ ٹھٹھولی
لاج کی ماری میں کچھ نہ بولی،
سن ری ہم جولی، منوا کی بولی

○

چھائے رنگوں کے بادل گھنیرے
آگ جلتی رہی تن میں میرے

پاس بیٹھی رہی منہ کو پھیرے
کھیلی بِردے میں آشا نے ہولی
بات میں نے جیا کی نہ کھولی
سن ری ہم جولی ، منوا کی بولی

○

اسکی باتیں تھیں ساون کے بادل
جیسے ملہار کے گیت کومل ،
جیسے اُوشا کا دھرتی پہ آنچل
میں نے پھیلا دی بردے کی جھولی
اس نے مصری مرے مَن میں گھولی
سن ری ہم جولی ، منوا کی بولی!

○

بولے ، ہے دُور اک میرا گھروا
رُوپ چندا سا ہے اُس نگر کا
اس میں چل کے رہے تو جو رادھا
تیری بھر دوں گا تاروں سے جھولی
اور چپکے سے میں ساتھ ہو لی
سُن ری ہم جولی ، مُنوا کی بولی

پاس بیٹھی رہی منہ کو پھیرے
کھیلی برہا میں آشا نے ہولی
بات میں نے جیا کی نہ کھولی
سن ری ہم جولی، منوا کی بولی

○

اسکی باتیں تھیں ساون کے بادل
جیسے ملہار کے گیت کومل،
جیسے اوشا کا دھرتی پہ آنچل
میں نے پھیلا دی برہا کی جھولی
اس نے مصری مرے من میں گھولی
سن ری ہم جولی، منوا کی بولی!

○

بولے، ہے دُور اک میرا گھروا
رُوپ چندا سا ہے اُس نگر کا
اس میں چل کے رہے تو جو رادھا
تیری بھر دوں گا تاروں سے جھولی
اور چپکے سے میں ساتھ ہو لی
سُن ری ہم جولی، منوا کی بولی

کُبتن

خاموش خوابیدہ ہے وہ

وہ کون ہے، غمگیں ہے کیوں

اس سے نہیں مجھ کو غرض،

پہلے جب آیا تھا یہاں

معصوم تھا دلکش تھا وہ،

کہتا تھا "جانِ من سنو!

میں کون ہوں، پہچان لو

پہچان کر اپنا کہو!

دل کو پیامِ عشق دو"

کل شب یہاں آیا وہ پھر

جیبوں میں سیم و زر بھرے

ہر اک نے اپنا حق لیا
مجھ کو ملی اک اشرفی
یعنی بہت اچھا تھا وہ!
میں نے سکینہ سے کہا،
اِس شب میں آمادہ نہیں
میری جگہ تم سو رہو،
مہماں ہے آخر کچھ تو ہو

○

نشے میں وہ مدہوش ہے
اس کو نہیں کچھ بھی خبر
پہلو میں اس کے کون ہے!

○

خاموش خوابیدہ ہے وہ
اس کو تھی کب مجھ سے غرض!
کتنی بھیانک شکل ہے!!
انساں نہیں بھتنا ہے یہ!!!

ماہیے

(بالو انتظار میں)

موسم ہے بہاروں کا
تم دور ہو کیوں مجھ سے — اے میرے سجل آقا

جب پاس کے گلشن میں
بلبل کوئی گاتا ہے — ہوتی ہے چبھن من میں

حالت ہے بُری دل کی ،
مانو یا نہ مانو تم ۔۔! ہے روگ جوانی بھی

سکھ چَین لُٹا سارا
پاس آ تو سہارا دو اس غم کا کرو چارا

جاں باقی نہیں تن میں
دل تیرے سواگت کو آ بیٹھا ہے نینن میں

مشکل میں مرا گھر ہے
میں جس میں اکیلی ہوں وہ درد کا ساگر ہے

ملنا ہے تو آ جاؤ
ساحل پہ کھڑے ہو کر آواز نہ دو ہم کو

کدھر جائے اولادِ آدم

کدھر جائے اولادِ آدم مسیحا
کہ دم گھٹ رہا ہے کلیسا میں اس کا
یہاں سے وہاں تک
حدِ لامکاں تک

فضاؤں میں عفریتِ مرگ آ بسے ہیں
خلا زیست کی روشنی کھو رہے ہیں
نگاہوں سے سب راستے گم ہوئے ہیں

اُلمپس — رنگیلے خداؤں کا مسکن
ردائے عدم اوڑھ کر سو گیا ہے
اُلمپس — گھرانے عشرت کا معدن
لٹا کر زرِ زیست چپ ہو گیا ہے

○

ہے اب حسنِ وینس فقط اک ستارا
ا یتھینے سے کرنوں کا دامن چھنا ہے
اپالو کو مصلوبِ اعظم نے مارا
زیوس آتشِ علم نو میں جلا ہے

○

شوالک کہ سرشار تھا زندگی سے
ہے اب اک پرانے تمدن کا مدفن
بھوزنگ قربان گاہوں کے نیچے
دباتے ہیں انساں نئے ماضی کے رہزن

○

لٹی پیروانِ مسیحا کے ہاتھوں

متاعِ فسونِ کلامِ پیمبر
کلیسا و راہب پریشاں ہیں دونو
مسیحا مگر بے خبر ہے فلک پر

○

عرب، مصر و ایران، مردانِ غازی
ہے سب کی نوا بے اثر، پا بجولاں
بجھی آگ گنگا میں گوتم کے دل کی
ہوئی گم متاعِ خلوصِ سُداماں

○

صدا یہ بھی آتی ہے ہر دم برابر
مزاحل ہیں تقدیرِ انساں چھپی ہے
نہ شو جی تھے کوئی نہ رحمانِ برتر
خداؤں کا خلاق خود آدمی ہے

○

کہاں ہیں
مسیحا نفس پیروانِ مسیحا،
کہاں ہیں

کہاں ہیں
محمدؐ کی تقدیس کے نام لیوا

کہاں ہیں
کہاں ہیں
مقالاتِ گوتم کے شیدا

کہاں ہیں
کہ اولادِ آدم کا دم گھٹ رہا ہے!
فضاؤں میں عفریتِ مرگ آ بسے ہیں!!
یہاں سے وہاں تک
حدِ لامکاں تک
خلا زیست کی روشنی ڈھونڈتے ہیں!!

بیکرانی

ہمیشہ مرے دل کو اچھی لگی ہے
یہ تنہا پہاڑی
ہمیشہ رہا جاگزیں میرے دل میں
یہ سنسان ٹیلہ
ہمیشہ مجھے سرخوشی دے گیا ہے
یہ اک سلسلہ جھاڑیوں کا کہ جس نے
چھپایا ہے میری نظر سے افق کا

ذرا سا کنارا،

ذرا سا کنارا عبارت ہے جو خود بھی پہنائیوں سے!

○

نظر دیکھتی ہے تو پھیلے ہوتے اس افق کا تصوّر

مرے ذہن پر بیکراں وسعتوں کے — خلاؤں کے در کھولتا ہے!

وہ خاموشیاں اور وہ گہرائیاں سب کہ ارضی نہیں ہیں

جو میرے تخیل سے، ادراک سے ماورا ہیں

مرے دل کو دہشت زدہ کر گئی ہیں!

○

اِدھر جب ہوا تیز اور تند ہو کر

نکلتی ہے شاخوں سے چلّاتی روتی

تو میں ان صداؤں کو اس خامشی کے مقابل بٹھا کر

ازل اور ابد کو

بیابانِ ماضی کے ان بیکراں فاصلوں کو

جو بیکارِ ہستی کی گرمی سے محروم ہو کر فنا ہو چکے ہیں

اور اِس عہدِ حاضر کے اِن فاصلوں کو

جو زندہ ہیں اور زندگی دے رہے ہیں

اور اس عہدِ حاضر کی آوازِ پا کو

تخیّل میں اک ساتھ پھیلا ہوا دیکھتا ہوں

اور ان بے اماں، بیکراں وسعتوں میں

میں ہنستا ہوا ڈوب جاتا ہوں اکثر

کہ ایسے میں اس بحر میں ڈوب مرنا بھی اک زندگی ہے!

(ماخوذ)

Scanned with CamScanner

تن سنگھ

فاتحِ کوہِ فلک بوس و گراں

چشمِ عالم تری عظمت کی اسیر

تیرے قدموں پہ سرِ عرش نگوں

تیری ہمت پہ دل و جان فدا

پُر مئے حوصلہ سے تیرا سبو

ہے نمایاں ترے ساغر میں مگر

تلخیٔ شائبۂ منتِ غیر!!

گیت

موہ میں جھوٹی رادھا کے کیوں بیاکل تیرا من ہے
یہ کیا پاگل پن ہے باولے یہ کیا پاگل پن ہے

○

راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر رونا، شبنم ہار پرونا
جھوٹے من موہن کی برہ میں سچے موتی کھونا
ہردے میں کاتک کا بسیرا نینوں میں ساون ہے
یہ کیا پاگل پن ہے باولے یہ کیا پاگل پن ہے

من باسی کی کھوج میں تیرا سب سکھ چین لٹا ہے

بے پتوار کی نیا ہے تو ہر دم ڈول رہا ہے

جھوٹی سچی آشاؤں میں اک گھمسان کا رن ہے

یہ کیا پاگل پن ہے باولے یہ کیا پاگل پن ہے

○

بھیس میں رادھا کے پھرتے ہیں چاروں اور لٹیرے

اپنا کام بنا کر بھاگیں لوٹیں شام سویرے

یہ رادھا کا دیس نہیں یہ راکھشوں کا بن ہے

تو جھوٹی رادھا پہ مٹا ہے بیاکل تیرا من ہے

○

یہ کیا پاگل پن ہے باولے یہ کیا پاگل پن ہے

گیت

اپنا آپ بچا کر رکھیو جگ سے ساجن میرے
اس نگری کے کھونٹ کھونٹ میں بھاگے پھریں لٹیرے
رہتے ہیں سونے کے مکٹ میں سوتے گھور اندھیرے
سانپوں سے کانٹوں سے بھرے ہیں دھن والوں کے بسیرے
اپنا آپ بچا کر رکھیو جگ سے ساجن میرے

روپ ہے تیرا دھوپ سا ساجن، نین ترے جیوں تارے
بال ہیں تیرے کالے کالے ساون کے ہرکارے
ہونٹ ترے جیوں کومل کلیاں سونا انگ ہیں سارے
اور پڑی ہے لوٹ جگت میں جاگ رہے ہیں لٹیرے
اپنا آپ بچا کر رکھیو جگ سے ساجن میرے

○

دیکھنا پانے کی چاہت میں اپنا آپ گنوا دو
من مندر کو کھنڈر بنا دو نینن دیئے بجھا دو
سونے کی اگنی سے کھیلو گھر میں راکھ بچھا دو
رونے سے پھر کب بستے ہیں اجڑے شام سویرے
اپنا آپ بچا کر رکھیو جگ سے ساجن میرے

سایۂ مریخ

مری جاں آ مرے دل کے قریب آ جا
کہ اب دِل اعتبارِ زیست کا دھوکہ نہیں کھاتا
مری جاں آ کہ ہم اک دو گھڑی مل بیٹھ لیں ورنہ
فضائیں خون آشامی کی عادی ہوتی جاتی ہیں
نہ جانے کب در و دیوار جل جائیں
نہ جانے کب پیامِ مرگ آ جائے
نہ جانے کب عروسِ زندگی کے ہونٹ سل جائیں!

مری جاں آ مرے دل کے قریب آ جا

کہ میں انجامِ بزمِ عالمِ امکاں سے ڈرتا ہوں

پڑی ہے عدل کی میزان خوں آشام ہاتھوں میں

اور ان ہاتھوں کی ہر جنبش پہ یہ میزان ہے رقصاں

انہی چالاک ہاتھوں میں ہے اک شمشیرِ برق آسا

اور اس تیغِ جہاں افگار سے دو نیم ہے دنیا

یہ دنیا دل ہے جو آفاق تک پھیلے ہوئے رنگیں جہانوں کا!

خدایانِ جہاں کوشاں کہیں ایسا نہ ہو جاتے

کہ اس دو نیم دل کو پھر دوائے وردِ دل جاتے

یہ گہرا زخم بھر جاتے

یہ دل کا چاک سل جاتے!

کوئی صورت نہیں پیدا قرارِ جانِ لرزاں کی

پریشاں ہے فضائے بزمِ عالم دیکھئے کیا ہو!

○

غضب ؎ ہے اپنے ہی گھر کو زباں سے اپنا کہنے پر

؎ یہ نو مصرعے میں نے بالکل اسی صورت میں ایک اور نظم "مرے جشنِ جہان [illegible]" میں بھی استعمال کیے ہیں۔

دکھا دی جائے آتش ہر رگِ گل کو گلستاں میں
دبا دی جائے آوازِ وفا تک خاکِ زنداں میں
جلا دی جائے بہرِ چارۂ غم چشمِ گریاں تک
اٹھا دی جائے اک دیوارِ ظلمت[1] چرخِ حیراں تک
اڑھا دی جائے رنگیں[2] وادیوں کو اک ردائے غم
بچھا دی جائے ہنستے بولتے[3] گھر میں صفِ ماتم
سلا دی جائے سینوں میں نوائے گریۂ پیہم
جلا دی جائے چارہ گر سے لے کر ہر کتابِ نشتر و مرہم

○

مری جاں آ مرے دل کے قریب آ جا
کہ اب عالم پہ پرافشاں ہے مریخِ جہاں تاراج کا سایہ
اُگے ہیں بستیوں میں اب ہزاروں آتشیں خیمے
نہاں ہیں جن میں بے اندازہ قوت کے سیہ عفریت جاں لیوا
وہ جب چاہیں یہ عالم لرزہ بر اندام ہو جائے

---

[1] مشرقی اور مغربی برلن کی درمیانی سرحد پر عائد کردہ پابندی اور ایستادہ دیوار   [2] کشمیر

[3] کانگو، ویت نام، روہوڈیشیا۔

وہ جب چاہیں خرامِ زیست کا اتمام ہو جائے!
غنیمت جان جو لمحے تجھے مل جائیں اِس آباد جنگل میں
جہاں تہذیبِ انسانی —
ترقی دورِ حاضر کی —
فقط اک اور پہلو ہے کسی وحشی کی فطرت کا!

○

مری جاں آ مرے دل کے قریب آ جا
کہ گر ادبار ہی مقسوم ہے اس عالمِ نو کا
تو ہم اس جذبۂ آفاق داماں کی حفاظت کا کریں ساماں
جسے فطرت نے تخلیقِ جہاں کا راز سونپا ہے!

پیاس

(دانشوروں کے نام)

چاندنی رات میں، راوی کے کنارے، خاموش

ایک شاعر ہے کہ تصویر بنا بیٹھا ہے

درد کی ، سوز کی تفسیر بنا بیٹھا ہے

○

شہرِ لاہور سے —— لاہور کے ہنگاموں سے

شاعرِ زیست بہت دور نکل آیا ہے ،

پاس خاموش درختوں کے گھنے سائے ہیں،

جن پہ فردوس کے محلوں کا گماں ہوتا ہے
جن سے وابستہ ہیں شاعر کی درخشاں راتیں
جن سے تخئیل کے پُرنور دیئے جلتے ہیں،
اِس طرح سرو درختوں کے سرے رُوشن ہیں
جیسے بُرّاق ہمالہ پہ سحر کا جلوہ!
یہ گھنے سائے، یہ اشجار کے روشن پتّے
ہستیٔ مجمعِ اضداد کے دو پہلو ہیں
منعکس ان میں ہیں شاعر کے لئے دو عالم
ان سے وہ زیست کی تصویر چُرا لیتا ہے
حسُن کی، عشق کی تعبیر چُرا لیتا ہے!

○

اور یہ وقفِ سفر، وقفِ تماشا راوی،
ایک ہی راہ پہ صدیوں سے بہا آتا ہے،
اس کا سینہ ہے کہ شفاف اک آئینہ ہے
جس پہ مہتاب کی دیوی نے نہا کر شاید
اپنی بھیگی ہوئی زلفوں سے گہر جھٹکے ہیں

اس کی لہروں کے جنوں خیز توجّ کی صدا
ایک بے چین خموشی کا پتہ دیتی ہے
دل کے ہر گوشۂ تیرہ کو ضیا دیتی ہے
پھر سے خوابیدہ زمانوں کو جگا دیتی ہے
اس نے دیکھا ہے زمانے کا سنورنا، لٹنا
اس کے دن گزرے ہیں اس درسگہِ فطرت میں
جس میں ہر غنچۂ نوخیز سے گُل بنتے ہیں
اس کی رفتار دل و روح پہ چھا جاتی ہے
جس طرف بڑھتا ہے اک راہ بنا لیتا ہے!

○

چاہتا ہوں، مجھے مل جائے وہ احساسِ دروں
جو مری روح کو ہمدوشِ ثریا کر دے
مجھ پہ ہر علم کے ہر فکر کے دَر وا کر دے
دل کو اس طور سے پھیلائے کہ دریا کر دے!
جس طرف جاؤں بڑھوں زیست کا دھارا بن کر
عزم وہ ہو کہ قدم بوس ہو منزل خود ہی،

اور ہیں زیست کے ہمراہ ہمیشہ، دائم
یونہی چلتا رہوں، بہتا رہوں، بڑھتا جاؤں
سیکھ کر وقت کی آغوش میں اسرارِ حیات
عرصۂ دہر کی تقدیر کا دل بن جاؤں

○

یاد ہے ایسے ہی ماحول میں صدیوں پہلے
مجھ کو اک بار یہ احساس دیا تھا تو نے
تیری آغوش میں گزرے تھے مرے جو لمحے
مجھ کو ان لمحوں نے وہ کیفِ جنوں بخشا تھا
جو مجھے زیست کا مفہوم بتا دیتا تھا
وہ فسوں، جذبۂ جنوں خیز نہ جانے کیا تھا
دل کچھ اس طور سے پھیلا تھا، بنا تھا دریا
بیکراں وقت کے مانند وہ پہنائی تھی
کائنات آپ سے اس دل میں سمٹ آتی تھی!

○

آج وہ جذبۂ جنوں ساتھ نہیں ہے، لیکن

میں ابھی تک اسی احساس کا شیدائی ہوں

یوں ہوا جاتا ہوں ہر رازِ نہاں سے محروم

جسم ہو جیسے کوئی نعمتِ جاں سے محروم

جیسے دریا ہو کوئی آبِ رواں سے محروم!

○

میری ہمدم، تجھے رخصت ہوئے صدیاں گزریں!

تیری یادیں مری سانسوں میں بسی ہیں —— لیکن

اب ترے قربِ جنوں خیز کے امکاں کم ہیں

تلخئ کرب نے ہر لحظہ سکوں چھینا ہے،

دمبدم حدتِ احساس بڑھی جاتی ہے

تو مرا دل تھی، مرا ذہن، مرا عالم تھی،

تو زمانہ تھی، تخیل تھی، نظر کا رم تھی،

میں تجھے کھو کے ہر اک چیز کو کھو بیٹھا ہوں

تو مرے پاس نہیں ہے تو میں اک صحرا ہوں

اور صحرا کی کبھی پیاس نہیں بجھ سکتی!

نوحہ

میں رونا چاہتا ہوں

شاعری کیا ہے،

مجھے اس سے غرض کب ہے

مرے نالے علامت ور علامت ہوں نہ ہوں

مجھ کو تو رونا ہے

مجھے حسنِ بیاں کی فکر کیوں

مجھ کو تو رونا ہے

مرے نالوں میں اسلوب و علامت ڈھونڈتے کیوں ہو

میں رونا چاہتا ہوں

کیا مجھے اتنی بھی آزادی نہیں حاصل!

نوحہ

مت رو ——————

آخر کس لئے روتا ہے تو

کیا نہیں اس کی خبر تجھ کو وہ آنسو

جو تیری چشمہائے ناتواں سے

گر کے اُسکی قبر کی مٹی میں پنہاں ہو گئے

اب تری آنکھوں میں آسکتے نہیں!

جانتا ہے گر تو پھر روتا ہے کیوں!

جانتا ہے گر تو پھر روتا ہے کیوں!

لیلائے فن کے نام

میں نے تیرے رُوپ کی خاطر گوندھے تشبیہوں کے ہار
تیرے نام کی لَو کو میں نے پہناتے شعروں کے تاج
تیری مانگ میں میں نے ڈالا تاروں کا اُجلا سیندور
جس کے نورِ رواں کے آگے کاہکشاں کو آتے لاج

○

دل نے تیری زلف کو سمجھا خوابوں کا روپہلا جال
اور ترے ہونٹوں کو جانا لال گلابوں کے تازہ پھول

تیرے نام گزرگا ہوں پر اپنے خون سے سینچی دوب
اور اپنے بالوں میں ڈالی روز ترے قدموں کی دھول

○

دل کے ساگر سے میں لایا جذبوں کے موتی انمول
سمرسے خیال کی لڑیاں لے کر سہرے پروتے کتنی بار
جیون امرت یوں برسایا جیسے نازک گھاس پہ اوس
اور ترے ماتھے پہ سجائے جگمگ کرتے یہ سب ہار

○

رنگا رنگ قبائیں میں نے تیرے جسم کو پہنائیں ،
اپنے بدن کا جی ترسایا ڈال کے اس پر الجھے تار
خونِ جگر کے اشک بنائے اور دھلائے تیرے ہاتھ
تینوں کی سب جوت تجھے دی تاکہ سجے تیرا گھر بار
تیرا داس بنا پر تو نے بھیک نہ دی مجھ کو اک بار
پھر بھی آس لگائے کھولے بیٹھا ہوں ہر دے کا دوار

رات کا گیت

میں اوّلِ شب کی شیریں نیندوں میں جھولتا تھا کہ تیرے خوابوں نے آجگایا
سبک ہوائیں ٹہل رہی تھیں فضا کی مستی میں تھیں خراماں
ستارے جگنو بنے ہوتے تھے چمک رہے تھے سنبھل سنبھل کر
وہ جانے کیا تھا جو مجھ کو تیرے حسیں جھروکے پہ کھینچ لایا
نہ جانے کیسے، نہ جانے کیوں کر اس آستانے پہ آگیا ہوں
یہ آستانہ جہاں ہوائیں مہک رہی ہیں!
یہ آستانہ جہاں محبت کی تازگی ہے!!
جہاں کی خاموش نغمگی میں سکون وراحت کی چاشنی ہے!!!

○

تمام بستی، تمام عالم، حسین تاریکیوں میں گم ہے

نجومِ سیمیں کی چھاؤں میں اک ندی خموشی سے بہہ رہی ہے

مہک نہ جانے کہاں کہاں سے ادھر چلی آ رہی ہے جیسے

ترا چھروکہ ہی اس کی رنگین خواب گہ ہے!

اُدھر بہت دور، ایک بلبل کچھ ایسے نغمے الاپتا ہے

کہ ساری بستی پہ بیقراری کا غم دھواں بن کے چھا گیا ہے

میں مخملیں گھاس پر پڑا ہوں بجھا ہوا سا مٹا ہوا سا

اب اقتضائے جفا سے دامن چھڑا کے آ اور اٹھا لے آ کر

یہاں سے مجھ کو

اور اپنی الفت کو بوسے بن کر مرے لبوں کو مرے پپوٹوں کو چومنے دے!

تری محبت میں میرے رخسار سرد اور زرد ہو گئے ہیں

مرے دلِ ناصبور کی دھڑکنیں بہت تیز ہو گئی ہیں

اٹھا کے مجھ کو تو اپنے سینے کی نرم پہنائی میں چھپا لے

وہاں اگر موت کے اندھیرے میں کھو بھی جاؤں تو غم نہ ہو گا!

(شیلے کی نظم INDIAN SERENADE کا آزاد ترجمہ)

پیکرِ سوزِ دروں

گرچہ وہ حسن جفا پیشہ ہے مائل بہ کرم

بادِ حیراں مری راتوں کا سکوں ہے پھر بھی

پھر بھی روتی ہیں شب تیرہ میں آنکھیں شبنم

پھر بھی ہر لحظہ ہے عالم کی فضا بوجھل سی

○

ان کے ہمراہ غمِ زیست کو دے کر دھوکا

سایۂ گُل میں جو لمحوں سے زمانے گزرے

جن کی سرمستی میں میں نے دمِ عیسیٰ ڈھونڈا
آخرِ کار وہ تنہائی میں زہراب بنے!

○

زیست پابندِ تغیّر ہے ، ہمیشہ ، دائم ،
دل سمجھتا ہے مگر قرب کو ہستی کی متاع
چاہتا ہے کہ رہے سایۂ گُل میں ہر دم
کب گوارا ہے اسے ایک بھی لمحے کا ضیاع!

○

ماسوا عشق ہر اک چیز ہوئی خاکستر
یوں بڑھی لحظہ بہ لحظہ غمِ دل کی تابش
اب سراپا ہے مرا سوزِ دروں کا پیکر
آتشِ عشق بہر حال ہے آتش آتش!

دیدۂ یعقوب

دیدۂ یعقوب جب ویراں ہوا
آفتابِ صبحِ کنعاں چھپ گیا

○

بن کے دلدارِ زلیخا یوسفِ بے کارواں
گو ہوا معتوبِ اورنگ و اوائے خسروی
پا گیا نام و نمود و دولتِ تختِ شہی
بے گنہ یوسف ہے۔ طفلِ بے زباں شاہد ہوا

بے گنہ یوسف ہے پھر یہ بھی صحیفے آ گئے

دیدۂ یعقوب کی تاریکیاں سب چھٹ گئیں!

○

ہے وہی انساں، وہی عالم، وہی ربّ الامیں

آج لیکن دیکھتا کوئی نہیں

کتنے یوسف ہو گئے بے کارواں

مصر کتنے جگمگا کر بجھ گئے

گم ہوئیں کتنی زلیخائیں یہاں!

○

ہے وہی کنعاں، وہی یوسف، وہی ربِّ کریم

آج لیکن پوچھتا کوئی نہیں

کتنے یوسف ہیں شکارِ رشتۂ خوں آج بھی

اور کتنے ہیں ابھی معتوبِ لطفِ خسروی!

○

ہے وہی آدم ــــ وہی یوسف ــــ وہی ربِّ غفور

ہے وہی چاہِ بیاباں ــــ زندگی کہہ لیں جسے

زندگی، ہر دم عتابِ تازہ کا عنواں لئے
زندگی دشنہ لئے، خنجر لئے، پیکاں لئے
ختم کیوں ہے آسمانوں سے صحیفوں کا نزول
آج بھی کیوں بے زبانوں کو زباں ملتی نہیں!

○

ہوٹلوں میں رقص گاہوں میں گھروں میں دشت میں
آرزؤں میں نگاہوں میں دلوں میں ذہن میں
ایک ویرانی مسلط ہے کہ کنعاں میں نہ تھی!
حسرتوں کی دُھول میں لپٹی ہوتی ہے زندگی
گم ہوا ہے ہر نظر سے اک نہ اک یوسف یہاں
ہر بشر اک دیدۂ یعقوب ہے!
لیکن اس کی تیرگی ہے بیکراں!
بے کراں
اور بے اماں
اور مستقل!!

حمدِ گنبدِ شب

ازل سے ہوں میں گنبدِ شب کا شیدا
جو روشن بھی ہے اور تاریک بھی ہے
(ہے جاں بخش بھی باعثِ درد بھی ہے)
مگر اس سے بڑھ کر تجھے چاہتا ہوں

میں تیرا پجاری
تجھے پوجتا ہوں
اے دریائے غم کے خُمِ تلخ بادہ

اے ظالم حسینہ

تو ہر لمحہ میری جسارت پہ حیراں

مثالِ حدِ گنبدِ شب گریزاں

میں ہر لحظہ تیرے لئے دل بداماں

میں ہر لحظہ کوشاں

کہ اس گنبدِ شب کی پہنائیوں کو

اور ان آسمانوں کے سب فاصلوں کو

مٹا دوں

اور اس لیلیِٰ شب (خمِ تلخ بادہ) کو پہلو میں رکھ لوں

ترا قرب پا لوں

میں بڑھتا ہوں اک آہنی عزم لے کر

مگر دیکھتا ہوں

مرے سامنے ایک یخ بستہ بیجان پیکر پڑا ہے

جیسے بھوکے کیڑوں کی مانند میں نوچتا ہوں

مگر اے حسینہ

بُتِ کم نما، سرو پیکر حسینہ

درندہ صفت جانِ محشر حسینہ

تری سرد مہری کہ ترے حسنِ جاں سوز کی روشنی کو بڑھا کر

مرے حوصلے کو نمو بخشتی ہے

میں بڑھتا ہوں پھر آہنی عزم لے کر

مگر دیکھتا ہوں

مرے سامنے ایک یخ بستہ بے جان پیکر پڑا ہے

جسے بھوکے کیڑوں کی مانند میں نوچتا ہوں

مگر اے حسینہ

درندہ صفت جانِ محشر حسینہ

میں تیرا پجاری

تجھے پوجتا ہوں

تری سرد مہری مرے حوصلے کو نمو بخشتی ہے

میں بڑھتا ہوں پھر آہنی عزم لے کر.....

....

(ماخوذ از بودلیئر)

شام

افق پر پڑا گیسوئے شب کا سایہ

تو پھولوں سے ظلمت دھواں بن کے اٹھی

ہواؤں میں سرگوشیوں اور موسم کی خوشبو نے لہرائے دامن !

اُدھر مضمحل رقص میں پاؤں بے دم

اِدھر کیف و مستی کی صہبا میں لرزاں

شبِ سست رو کی اداسی کا چہرہ

اٹھا ذہن میں ایک گردابِ حسرت

المناک نغمات سازوں سے نکلے

کسی غم زدہ دل سے نوحے کی صورت

تڑپتے سسکتے

فلک دل کشی اور اداسی کا مظہر

صلیبوں سے آراستہ شہر جیسے

نوائے تپیدہ سے ہر ساز بوجھل

کسی قلبِ بیمار میں کرب جیسے

وہی قلبِ بیمار جس کی نزاکت

فضاؤں میں پھیلے اندھیروں سے ترساں

وہ نازک غمیں دل

خیابانِ ماضی کے ہر برگ گل کو

جوابِ خشک و بے جان ہے امر چکا ہے

خیالوں کی اک ادھ کھلی سی ردا ہے

سمیٹے پڑا ہے!

اُدھر مہرِ گُم اپنے ہی خون کی منجمد تیرگی میں

ادھر دل میں تیرے خیالوں کا مہتاب روشن!!

(ماخوذ از بودلیئر)

تقابل

افلاک کا ہر تارا
ہر آنکھ کا مہ پارا

میری ہی طرح روشن
میری ہی طرح سوزاں
میری ہی طرح تنہا
میری ہی طرح عریاں

میری ہی طرح لرزاں

میری ہی طرح قائم

میری ہی طرح فانی

میری ہی طرح دائم

لیکن میں غمیں ہردم

اور اس کو نہیں کچھ غم

ہر صبح کو مرتا ہے

ہر شب کو ابھرتا ہے!

○

صحراؤں کا ہر رستہ

خدمت پہ کمر بستہ

میری ہی طرح افتاں

میری ہی طرح خیزاں

میری ہی طرح محزوں

میری ہی طرح حیراں

میری ہی طرح ویراں

میری ہی طرح سونا
میری ہی طرح پنہاں
میری ہی طرح پیدا
مٹتا ہے پہ مٹنے کا
احساس نہیں رکھتا
اک پل میں بگڑتا ہے
اک پل میں سنورتا ہے

○

افلاک کا ہر تارا
صحراؤں کا ہر رستہ

کوئی بھی تو ان سب میں
بےبس نہیں مجھ ایسا
ہے کچھ تو جو ان سب کو
دل دیتا ہے جینے کا
تنہائی میں جیتے ہیں
آلام سے بے پروا

لیکن مری آنکھوں نے
ہر رنگ میں غم دیکھا
میں وقت کی اک سلوٹ
اور وقت مرا دریا
ہر نسل مرا پرتو،
ہر دَور میں مَیں تنہا
آتا ہوں میں جانے کو
اور جا کے نہیں آتا
ہوں سب میں تو میں یک ہوں
ہوں تنہا تو ہوں تنہا

بنتا ہوں تو مٹتا ہوں!
مٹتا ہوں تو مٹتا ہوں!!

مرے وحشی جہانِ نو

جہانِ نو

مرے وحشی جہانِ نو

ترے قدموں میں کس کا کاسۂ سر ہے

ترے ہاتھوں پہ کس کے خون کی سرخی دمکتی ہے

مرے وحشی

کہیں کس سے کہ وہ بستی

جہاں دریا مچلتے ہیں

جہاں گلشن مہکتے ہیں

نشانہ بن رہی ہے آتش و آہن کے طوفاں کا

گری ہے اس دیارِ گُل پہ برقِ ناگہاں یوں

بے اماں، خنجر بکف، سوزاں

کہ آزادی کا طائر پر بریدہ، تن دریدہ ہے

(سنو اے ساکنانِ خطہ ہائے مشرق و مغرب

مرا کشمیر اب بھی فطرتِ جانِ آفریں کا نورِ دیدہ ہے)

○

جہانِ نو

تو نازاں ہے کہ تو نے ذہنِ انساں کو —

فرومایہ فقیرِ وحشتِ امکاں کو —

خدائے بحر و بر جانا

نہ جانا تو نے لیکن کیوں تری تعمیر میں مضمر خرابی ہے

مرے وحشی جہانِ نو

غضب[1] ہے اپنے ہی گھر کو زباں سے اپنا کہنے پر

دکھا دی جائے آتش ہر رگِ گُل کو گلستاں میں

---

[1] یہ دو مصرعے ایک اور نظم "سایۂ مریخ" میں بھی شامل ہیں

دبا دی جائے آوازِ وفا تک خاکِ زنداں میں

جلا دی جائے بہر چارۂ غم چشمِ گریاں تک

اٹھا دی جائے اک دیوارِ ظلمت چرخِ حیراں تک

اڑھا دی جائے رنگیں وادیوں کو اک ردائے غم

بچھا دی جائے ہنستے بولتے گھر میں صفِ ماتم

سلا دی جائے سینوں میں نوائے گریۂ پیہم

جلا دی جائے چارہ گر سے لے کر ہر کتابِ نشتر و مرہم

○

مرے وحشی جہانِ نو

اٹھا لے ہاتھ آنکھوں سے

کلاہِ عظمتِ تہذیب سر سے پھسلا جاتا ہے

کرم گستر نگاہوں کو جھکا کر دیکھ کیا ہے تیرے قدموں میں

اٹھا کر دستِ خونیں میں اسے پہچان یہ کیا ہے

یہ کس کا کاسۂ سر ہے

یہ کس کا خونِ ناحق ہے

کہیں کس سے کہ تو نے ایک فریادی کی جاں لے لی!

○

مرے وحشی جہانِ نو
مجھے تسخیر کرنا ہے
تری تہذیبِ حاضر کے
دلِ بے حس کو — وحشی کو
صلیبِ ابنِ مریم رکھ کے کاندھے پر
شعاعِ علمِ گوتم لے کے آنکھوں میں
محمدؐ کی وفا کا ہاتھ میں اونچا علم لے کر
ہوئی تحریر جس سے لوحِ آدم وہ قلم لے کر
متاعِ فن، متاعِ زندگی ہر دو بہم لے کر!

سراب

شام گہری ہوئی سورج کا سفر ختم ہوا

زندگی کوچہ و بازار سے بیگانہ ہوئی

رقص گاہوں کے مسیحاؤں کے پاس آ بیٹھی

شب کی تاریکی میں بے نور اجالے ابھرے

رقص گاہوں کے ہر اک گوشے سے کجلاتے ہوتے

اپنی کم مائیگیٔ زیست پہ شرماتے ہوتے

مات جیسے ہو کوئی شاطرِ نو کھاتے ہوتے!

○

دل کہ سودائیِ لیلائے سکوں تھا ـــــ دن بھر
کارِ ہستی میں الجھ کر بھی اسے پا نہ سکا
بے طلب فرصتِ لمحات ملی اس کو، تو بے حال ہوا
لے چلا مجھ کو سوئے رقص گہہِ حسن و جمال

○

اک چھناکہ سا ہوا، جیسے پکارے کوئی
انگلیاں ساز کے پردوں پہ ہوئیں رقص کناں
اور نغموں کے دل افگار شرارے پھوٹے
جام ٹکراتے لبِ آزاد ہوئے شور اٹھا
جسم آواز کی ہر تال پہ لہرانے لگے

جسم ـــ بے چین سے، بے صبر سے، بے تاب سے جسم
جسم ـــ بے سوز سے، بے جان سے، بے روح سے جسم
جسم ـــ گل ریز سے، گل پوش سے، گل نار سے جسم
رقص کرتے ہوئے لہراتے ہوئے آنے لگے
دل کی ہر چوٹ کو یوں دور سے سہلانے لگے
جیسے کوئی بچے کو بہلانے لگے!

○

ناچ رقاصہ کہ تجھ پر ہے دلوں کی بارش

چھن چھنا چھن تری جھانجن کی یہ یورش توبہ

کتنی مسرور ہے کس درجہ حسیں لگتی ہے

عارض ولب ہیں کہ پیشانی کہ چشم

تیرے ہر عضو سے نغمات کے جھرنے ہیں رواں

کتنی بشاش ہے آزاد ہے جیسے پُروا

کتنی معصوم ہے بے لوث ہے جیسے بادل

تو سبک رو ہے سبک گام سبک جسم ہے تو

ایسے لگتا ہے کہ بس مائل پرواز ہے حسن

ایسے میں چھونا تجھے پاس ترے آجانا

تیری رفتار کو جادو کو ترے رکوانا

اک ستم ہے کہ نہ مجھ سے ہوگا

منتظر ہوں میں یہاں

ہال کے اک کونے میں

رقص رک جاتے تو پاس آؤں ترے

اور پوچھوں تری آنکھوں ترے ہونٹوں تری پیشانی سے ـــــ

تم نے یہ نور، اجالا یہ کہاں سے پایا؟
رقص کرتی یہ خوشی تم نے کہاں سے چھینی؟

○

ختم ہوا رقص — مگر تجھ پہ یہ کیا ظلم ہوا
وہ ترا نور ترا حسن، وہ افسوں تیرا
اب کہاں ہے؟ یہ ترے چہرے پہ سایہ کیسا؟
ہاں میں سمجھا تو بھی جنت کی تمنائی ہے
اک دلِ زارِ غم آثار کے بہلانے کو
اس بیابانِ دل وجاں میں چلی آتی ہے
کتنا کم فہم تھا کس درجہ خود آزار تھا میں
رقص کرتے ہوتے لاشے کو جو انساں سمجھا
دل کے ہر درد کا درماں سمجھا!

پیراہنِ یوسف

غزلیں

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ

لے جاؤ یہ کرتہ میرا اور ڈالو منہ پر میرے باپ کے کہ چلا آوے آنکھوں سے دیکھتا

(قرآن حکیم)

ملتا نہیں بازار سے پیراہنِ یوسف،

یعقوب ہوں تاریکیِ کنعاں میں پڑا ہوں

○
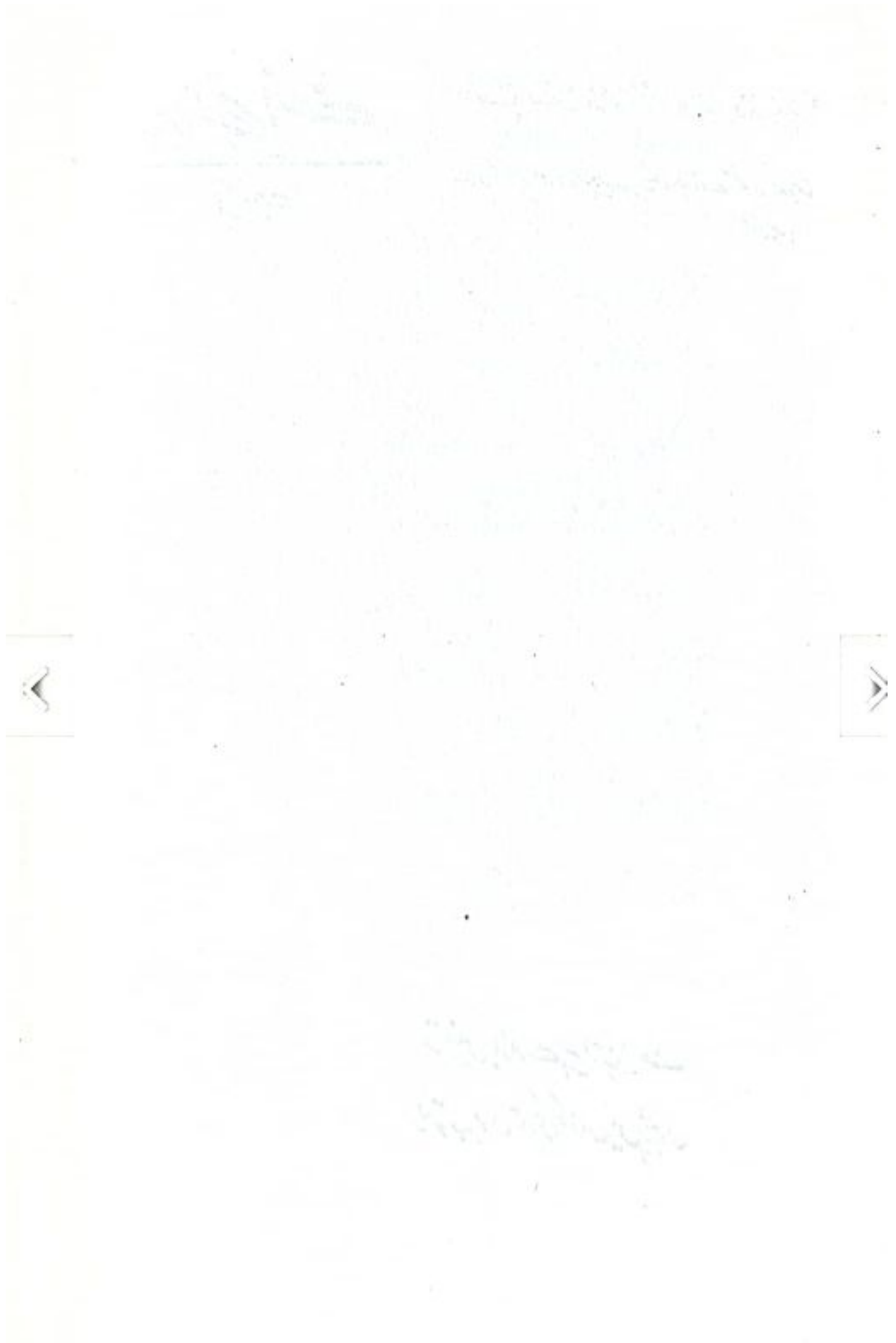
بس ایک ہی کیفیتِ دل صبح و مسا ہے
ہر لمحہ مری عمر کا زنجیر بپا ہے

میں شہر کو کہتا ہوں بیاباں کہ یہاں بھی
سایہ تری دیوار کا کب سر پہ پڑا ہے

ہے وقت کہ کہتا ہے رکوں گا نہ میں اک پل
تو ہے کہ ابھی بات مری تول رہا ہے

میں بزم سے خاکسترِ دل لے کے چلا ہوں
اور سامنے تنہائی کے صحرا کی ہوا ہے

آواز کا تیشہ ہے نہ خاموش تکلّم
تالا جو زباں پر تھا وہ اب دل پہ پڑا ہے

میں ساتھ لئے پھرتا ہوں سامانِ ہلاکت
رگ رگ میں مری زہرِ وفا دوڑ رہا ہے

کیا کیا ہیں تمنائیں دلِ خاک بسر میں
یہ قافلہ ویرانے میں کیوں ٹھہرا ہوا ہے

سمجھائے کوئی کیسے انہیں عرشؔ مری بات
سنتے ہیں سمجھتے ہیں پہ کہتے ہیں کہ کیا ہے!

○

تابندہ حسن زارِ بہاراں ہمیں سے ہے
نظمِ خزاں جو ہے تو پراساں ہمیں سے ہے

اپنے لہو کا رنگ ملا ہے بہار میں،
لالہ مثالِ شعلۂ رقصاں ہمیں سے ہے

جلتا ہے اپنا خوں ہی سرِ بزم رات بھر
اے حسنِ بے خبر یہ چراغاں ہمیں سے ہے

ہم آج شہریار کے معتوب ہیں تو کیا!
ہر دم وہ اپنے شہر میں ترساں ہمیں سے ہے

رکھی ہے ہم نے اپنی زباں پر وفا کی تیغ ،
نامِ کوئے یار پر افشاں ہمیں سے ہے

ہر رنگ میں رہے ہمیں سرچشمۂ حیات
ہے کائنات ہم سے تو یزداں ہمیں سے ہے

مرہونِ شوقِ بادہ گساراں ہے دورِ جام
مینا حضورِ یار غزلخواں ہمیں سے ہے

شہرہ ترا گیا مرے نغموں کے ساتھ ساتھ
عالم کو تیری دید کا ارماں ہمیں سے ہے

آنکھوں میں عرشِ درد نے بھڑکائے ہیں کنول
آبِ رواں میں آتشِ سوزاں ہمیں سے ہے

درد کو ہم زندگی کا کیف و کم کہتے رہے
خامشی کے ساز پر رودادِ غم کہتے رہے

گوش بر آواز پوری بزم میں کوئی نہ تھا
داستانِ آرزو کہتے کو ہم کہتے رہے

انتہائے یاس میں چلتے رہے بے مدعا
دیکھنے والے ہمیں ثابت قدم کہتے رہے

دل فریبِ زندگی میں بے طرح الجھا رہا
عشق کو آزار پیکر کو صنم کہتے رہے

کم سوادوں کو مسیحا ناخداؤں کو خدا
بود کو نابود ہستی کو عدم کہتے رہے

اپنے خوں سے داستانِ غم رقم کرتے رہے
لوحِ دِل کو، نوکِ خنجر کو قلم کہتے رہے

آرزو کے کتنے بت خانے تھے اس دل میں نہاں
عرش جس دل کو سبھی طاقِ حرم کہتے رہے

○

ہم اس لئے بن مے پئے بیٹھے ہیں ادب سے
مستی میں کوئی بات نکل جائے نہ لب سے

مانا کہ وہ آئیں گے ستاروں کے جلو میں
یہ دن — یہ شبِ دشت تو گزرے کسی ڈھب سے

اک بار تو مل جائے وہ گزرا ہوا لمحہ
ہے منتظرِ دوش نہ جانے کوئی کب سے

آنکھیں نہ اٹھائیں سوئے مہتاب نہ دیکھا
دیکھا ہے تصور نے ترا راستہ جب سے

یہ صبر، یہ ناموسِ طلب دادِ طلب ہے
اک وعدۂ فردا پہ جیے جاتے ہیں کب سے

کیا کیا نہ بہاروں نے یہاں جشن منائے
طوفانِ الم دب نہ سکا شورِ طرب سے

تاریکیٔ ادبار و الم دور تو ہو جاتے
ہے مہر بہت دور مگر منزلِ شب سے

اک حرفِ تقاضا سے فضاؤں میں ہوا شور
لرزیدہ ہوا قصرِ ستم جنبشِ لب سے

بنتے ہیں وہی عرش سراغِ رہِ منزل
جوں شعلہ فروزاں ہیں جو کچھ لوگ عجب سے

○

غم کی گرمی سے دل پگھلتے رہے

تجربے آنسوؤں میں ڈھلتے رہے

ایک لمحے کو تم ملے تھے مگر ،

عمر بھر دل کو ہم مسلتے رہے

صبح کے ڈر سے آنکھ لگ نہ سکی

رات بھر کروٹیں بدلتے رہے

زہر تھا زندگی کے کوزے میں

جانتے تھے مگر نگلتے رہے

قافلے میں ملے سبھی تنہا

گرچہ سب ساتھ چلتے رہے

دل رہا سرخوشی سے بیگانہ
گرچہ ارماں بہت نکلتے رہے

اپنا عزمِ سفر نہ تھا اپنا
حکمِ ملت رہا تو چلتے رہے

زندگی سرخوشی جنوں وحشت
موت کے نام کیوں بدلتے رہے

ہو گئے جن پہ کارواں پامال
سب انہی راستوں پہ چلتے رہے

دل ہی گر باعثِ ہلاکت تھا
رُخ ہواؤں کے کیوں بدلتے رہے

ہو گئے خامشی سے ہم رخصت
سارے احباب ہاتھ ملتے رہے

ہر خوشی عشرتِ وجہہ دردبنی
فرشِ شبنم پہ پاؤں جلتے رہے

○

روشنی بن کے ستاروں میں رواں رہتے ہیں
جسمِ افلاک میں ہم صورتِ جاں رہتے ہیں

ہیں دلِ دہر میں ہم صورتِ اُمّید نہاں
مثلِ ایماں رخِ ہستی پہ عیاں رہتے ہیں

جو نہ ڈھونڈو تو ہمارا کوئی مسکن ہی نہیں
اور دیکھو تو قریبِ رگِ جاں رہتے ہیں

ہر نفس کرتے ہیں اک طرفہ تماشا پیدا
ہم سرِ دار بھی تزئینِ جہاں رہتے ہیں

اور بھی اہلِ نظر ہیں کبھی دیکھو تو سہی
ہم بھی اس شہر میں اے کم نظراں رہتے ہیں

دل کی دھڑکن سے ملا ان کا پتہ کچھ ہم کو
کس کو معلوم تھا ورنہ وہ کہاں رہتے ہیں

وسعتِ دشت نہیں راس چمن زادوں کو
ہم ترے شہر کی جانب نگراں رہتے ہیں

اشک گرتے ہیں تو کچھ دل کو سکوں ملتا ہے
ہائے وہ لوگ جو محرومِ فغاں رہتے ہیں

زندگی بھر کا ہے احباب سے اس دشت میں ساتھ
مثلِ جاں رہتے ہیں ہم عرشِ جہاں رہتے ہیں

○

یارائے گفتگو تھا جنہیں تھے وہ شاد کام

ہم ایسے کم زباں تھے کہ جلتے رہے مُدام

گلشن میں اب کے سال رہا خوب انتظام

بادِ صبا نہ لے کے گئی سوئے گل پیام

ہر ملتجی پہ ان کے تبسم نے کی نظر

بارِ گراں ہوا تو ہوا اک مرا سلام

خود محتسب پلایا کیا اس کو رات بھر

ایسا بھی بزمِ یار میں دیکھا ہے انتظام

اک لمحۂ گریز ہوا باعثِ جنوں

اک پل کی داستاں ہے مری وحشتِ دوام

تھا ہر فریبِ دستِ نہفتہ نظر سے دور

دیکھا تھا چشمِ دل نے فقط حسنِ رنگِ دام

بیٹھا ہوں جامِ دل میں لیے حسرتوں کی مے

آئیں وہ گر ادھر تو رہے کچھ تو اہتمام

تھے محتسب کے سامنے کیوں ہم ہی فتنہ کار

گر ہم نہ پارسا تھے تو کب وہ تھے نیک نام

پھر عمر چاہیے کہ ملے کوئی ہم نوا

پل بھر میں طے ہو سکے نہ اگر مرحلے تمام

اک جذبۂ لطیف سے وابستہ ہے حیات

عرشِ علیٰ کا پائے محبت پہ ہے مقام

○

دیدنی اب سفرِ زیست کا منظر ہوگا
جس نے لوٹا سرِ بازار وہ رہبر ہوگا

حالِ دل کہہ کے ہوتے اور گرفتارِ الم
ہم نہ کہتے تھے کہ یوں درد فزوں تر ہوگا

جیتے جی ہم سے کبھی حرفِ وفا کہہ ڈالو
پھر یہ ہوگا بھی جو احسان تو کس پہ ہوگا

تو مری جرأتِ گفتار پہ حیراں کیوں ہے
یہ تماشا تری سرکار میں اکثر ہوگا

ان کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے تارے دیکھے
اب تو ناصح بھی پشیمان برابر ہوگا

ہم بھی اب عرشؔ نیا بابِ وفا کھولیں گے
شہپرِ شوق مہ و مہر کا ہمسر ہوگا

○

ہم کہ خاموش سوئے اہلِ بیاں دیکھتے ہیں
رازِ اندازِ تکلم سے عیاں دیکھتے ہیں ،

جان لیوا ہے فریبِ رہِ گلزارِ طلب
نشترِ شوق قریبِ رگِ جاں دیکھتے ہیں

ہے اسی گھر میں کہیں گوہرِ امید نہاں
سوئے ویرانۂ دل بہرِ اماں دیکھتے ہیں

کیسے بنتا ہے لہو سرخیٔ افسانۂ دل
کیسے بنتا ہے قلم نوکِ سناں دیکھتے ہیں

آتشِ شوق کو رکھتے ہیں بہر طور جواں
خاکِ گلشن میں زرِ گل کے نشاں دیکھتے ہیں

خشمگیں آج وہ یوں ہیں کہ نہیں تابِ سخن
عرشؔ ہم آج ترا زورِ بیاں دیکھتے ہیں

○

اتنی ہوا نہ واعظِ دیندار باندھیے
عزت سنبھالیے سرِ دستار باندھیے

گم کیجیے حواس کو تفسیرِ ہوش میں
دانش کو جہل، جہل کو پندار باندھیے

محرومِ ہوش ہو تیے پر دیجیے دادِ ہوش
گل کو گیاہ، وحشت کو گلزار باندھیے

بُو چھینیے گُلوں سے کہ دیتے ہیں فرقِ فن
یُوں خوشنوا طیُور کی چہکار باندھیے

اب جُز ہوا نہیں ہے گرہ میں ہماری خاک
سو بار کھولتے اسے سو بار باندھیے

بھڑکی ہے آگ عرشِ خیابانِ بزم میں
حدِّ جلالِ شعلۂ گفتار باندھیے

ہم کبھی چشمِ زمانہ سے نہ پنہاں ہونگے
ہم ہر اک دَور میں ہر دل میں نمایاں ہونگے

درد بن کر نفَسِ نے میں سما جائیں گے
سوز بن کر حرَمِ دل میں فروزاں ہونگے

ہم خزاں ہو کے بھی ہیں رونقِ بزمِ عالم
ہم نہ ہوں گے تو کہاں جشنِ بہاراں ہونگے!

ہم جلیں گے کہ ترے نام کی لَو روشن ہو
ہم بہر رنگ تری زلیست کا ساماں ہونگے

سوزشِ درد میں ہے عرشؔ قیامت پنہاں ،
وہ بھی کیا ہوں گے جو اس درد کا درماں ہونگے

Scanned with CamScanner

دل خوں ہے دل کا حال رقم ہو تو کس طرح
دل سے قلم کا فاصلہ کم ہو تو کس طرح

دل ہے کہیں، دماغ کہیں اور ہم کہیں
شیرازۂ حیات بہم ہو تو کس طرح

کیونکر کہیں کہ درد نہیں حاصلِ حیات
پیشِ نظر جو ہے وہ عدم ہو تو کس طرح

دل سے زباں، زباں سے کھنچی طاقتِ سخن
مائل اِدھر مزاجِ صنم ہو تو کس طرح

دلکش بہت ہے ترکِ تعلق کا مشورہ
خود پر مگر یہ طرفہ ستم ہو تو کس طرح

مَیں اور میرے گرد یہ تنہائی رَ سُقر
اے دل علاجِ سوزِ الم ہو تو کس طرح

کیوں ضد ہے شہریار کو اے عرش اسقدر
یہ سر کہ وقفِ دار ہے خم ہو تو کس طرح

Scanned with CamScanner

○

اک تیری بے رخی سے زمانہ خفا ہوا
اے سنگدل تجھے بھی خبر ہے کہ کیا ہوا

دریوزہ گر سمجھ کے تو تھی ملتفت حیات
وہ یوں کہو کہ دامنِ دل ہی نہ وا ہوا

ڈوبا کچھ اس طرح سے مرا آفتابِ دل
سب کچھ ہوا یہ پھر نہ سحر آشنا ہوا

یوں اس کے در پہ بیٹھے ہیں جیسے یہیں کے ہوں
ہائے یہ دردِ عشق جو زنجیرِ پا ہوا

چھینی ہے عشق نے تب و تابِ دماغ و دل
میں کیسے شاہ زور سے زور آزما ہوا

گھر سے چلو تو باندھ کے سر سے کفن چلو
شہرِ وفا سے دشتِ فنا ہے ملا ہوا

دل دے کے خوش ہوں میں کہ حفاظت کا غم گیا
تجھ سے قریب ہے وہ جو مجھ سے جدا ہوا

لب سے لگا تو بھول گئے ہم غمِ حیات
ساغر میں کوئی تجھ سا حسیں ہے چھپا ہوا

پی ہم نے خوب آتشِ کشیدۂ نگاہ و دل
کس میکدے کا در تھا جو ہم پر نہ وا ہوا

○

جہاں کے دل میں لہو بن کے پھر رہے ہیں ہم
ارم ہے خاک نشینوں کے نام سے عالم

ہماری ذات سے ہے بزم کائنات میں رنگ
کہ ہم نہ تھے تو نظام حیات تھا برہم

جو ہم نہ ہوں گے تو ہو گا یہاں ہمارا نام
کہ نقش وقت کے ماتھے پہ ہو گئے ہیں ہم

مرا قرار ہے پنہاں بھڑک کے جلنے میں
مرے چراغِ وفا کی نہ ہوگی لَو مدھم

حدودِ دل کو ملا دے حدودِ دوراں سے
مری وفا کا ترے دل میں گھٹ نہ جائے دم

ہماری آتشِ دل ان کے دل میں جا پھوٹی
ہمیں فراق میں جلنے کا اب نہیں ہے غم

خروشِ زیست رہا عرشؔ ہر نفس تازہ،
شکستِ دل کی صدا آ رہی ہے گو پیہم

○

اٹھا جو دستِ ستم قتلِ بے نوا کیلئے

نگاہِ شوق نے بوسے ہر اک ادا کیلئے

مہک ہے تیرے شبستاں کی بوئے زلفِ صبا

چلی ہے بادِ سحر اک شکستہ پا کیلئے

سنو کہ دل کو مرے اعتبارِ زیست نہیں

رکا ہوں ایک نفس عرضِ مدعا کیلئے

مرے خیال نے پہنا لباسِ حرف و ندا

صریرِ خامہ ہے رقصاں مری نوا کیلئے

دیارِ دل تو ہوا وقفِ آہوانِ جواں
اب اور کوئی بنائیں گے گھر خدا کیلئے

مرے خیال کو قیدِ مکاں قبول نہیں
حدودِ بحر و بیاباں نہیں ہوا کیلئے

رہی نظر میں ہمارے عروسِ شوق مدام
فنا ہے زیست رہے زیست کی بقا کیلئے

کسے بتائیں کہ ہم نے پلا کے خونِ جگر
چمن میں پھول کھلائے تری قبا کیلئے

خیال و رنگ و نقوش و حروف و لوح و قلم
بچھے ہیں دامِ جمالِ گریز پا کیلئے

فلک نے از رہِ انصاف ان سے عرشِ حزیں
ہمارے قتل کے بدلے رُلا رُلا کیلئے

خیال و خواب کے سائے میں ہم رہے برسوں
بڑھے نہ آگے درِ کوئے یار سے برسوں

چلی ہے اہلِ جنوں کی خدائے کعبہ سے
کہ اس دیار میں بھٹکے ہیں دل جلے برسوں

ترے بغیر وہ بدلی فضائے زیست کہ ہم
اسیرِ حلقۂ زنجیرِ غم رہے برسوں

بساطِ غم نہ اٹھائی حیات تیرہ نے
کچھ ایسے دور ہوئے ہم نہ مل سکے برسوں

گذرِ بہار کا ہوتا رہا اِدھر، لیکن
تہی حیات سے دامانِ گل رہے برسوں

رہے اک عمر اسیرِ خیالِ سود و زیاں
بڑھا کئے من و منزل میں فاصلے برسوں

رہے جنوں ہی جہاں رہنما تے ہوش و خرد
مرے قریب نہ آئے وہ مرحلے برسوں

کبھی تو ان کا گزر ہو اس انتظار میں ہم
چراغِ راہ بنے اور جلا کئے برسوں

انہی کے ساتھ گئی تھی روحِ بزمِ طرب
لٹے لٹے سے نظر آتے میکدے برسوں

پھر اسی شہر کا فسانہ چھیڑ
مطربہ طرزِ عاشقانہ چھیڑ

سازِ دل سے اٹھا تھا جو اک بار
پھر وہی راگ والہانہ چھیڑ

گھر ہے تاریک یورشِ غم سے
آج اک آتشیں ترانہ چھیڑ

پھر جہاں دلکشی سے ہے محروم ،
زلفِ ہستی کو مثلِ شانہ چھیڑ

بزم خوفِ فنا سے ہے بیدم
کچھ باندازِ جاودانہ چھیڑ

آج ہر شئے سے بدگماں ہیں ہم
مت ہمیں اے غمِ زمانہ چھیڑ

اے غمِ یار ہم ہیں خاکستر
اور مت اے رفیقِ خانہ چھیڑ

عرش، تھی ہر سکوں کی جو رہزن ،
اس قیامت کا پھر فسانہ چھیڑ

چمن سے اُٹھ کے وہ گُل جائیں تو کہاں جائیں
جنہیں وطن کی فضائیں نہ سازگار آئیں،

حیات مانگ کے لی تھی نہ موت مانگیں گے
نہیں طریق ہمارا کہ ہاتھ پھیلائیں

یہ دل کہ مدفنِ صد آرزو ہے برسوں سے
کہو وہ بات کہ مدفن پہ پھول اُگ آئیں

جہاں ہے ہم سے کہ ہم وہ نسیمِ گلشن ہیں
چلیں تو پیار کی خوشبو فضا میں پھیلائیں

نظر فریب ہے ہر دم جہاں کی صد رنگی
ہے اور بات کہ ہم زندگی کا غم کھائیں

بفیضِ جذبۂ پنہاں عرش ہم وہاں ہیں جہاں
نظر اٹھا نہ سکیں لب سے کچھ نہ کہہ پائیں

○

بیٹھا ہوں وقفِ ماتمِ ہستی، مٹا ہوا
زہرِ وفا ہے گھر کی فضا میں گھُلا ہوا

خود ان کے پاس جاؤں نہ ان کو بلاؤں پاس
پایا ہے وہ مزاج کہ جینا بلا ہوا

اپنی زباں کو آج وہ تاثیر ہے نصیب
جس کو خدا نے حسن کہا وہ خدا ہوا

اس پر غلط ہے عشق میں الزامِ دشمنی
قاتل ہے میرے حجلۂ جاں میں چھپا ہوا

جاں ہے تو فکرِ عشرتِ بزمِ جہاں بھی ہے
کب دل سے دردِ عالمِ امکاں جُدا ہوا

ہیں جسم و جاں بہم یہ مگر کس کو ہے خبر
کس کس جگہ سے دامنِ دل ہے سِلا ہوا

ہے راہوارِ شوق پہ آسیبِ بے دلی
رکھا ہے کب سے سامنے ساغر بھرا ہوا

حاصل ہے جس کو وسعتِ فضاؤں پہ اختیار
وہ دل کے ساتھ کھیل رہا ہے تو کیا ہوا

○

سنگِ در اس کا ہر اک در پہ لگا ملتا ہے
دل کو آوارہ مزاجی کا مزا ملتا ہے

جو بھی گُل ہے وہ کسی پیرہنِ گُل پہ ہے
جو بھی کانٹا ہے کسی دل میں چُبھا ملتا ہے

شوق وہ دام کہ جو رخصتِ پرواز نہ دے
دل وہ طائر کہ اُسے یوں بھی مزا ملتا ہے

تیرا شہرہ ہے زمینِ آبلہ پائی کا مری ،
ذرے ذرے سے ترے گھر کا پتہ ملتا ہے

وہ جو بیٹھے ہیں بنے ناصحِ مشفق سر پر
کوئی پوچھے تو بھلا آپ کو کیا ملتا ہے

ہم کہ مایوس نہیں ہیں انہیں پا ہی لیں گے
لوگ کہتے ہیں کہ ڈھونڈے سے خدا ملتا ہے

دامِ تزویر نہ ہو، شوق گلوگیر نہ ہو ،
میکدہ عرش ہمیں آج کھلا ملتا ہے

○

یوں نہ کوئی تری محفل میں پریشاں ہو جائے،
جیسے آوازِ صبا دشت میں حیراں ہو جائے

منتظر ہیں مری آہٹ کی بلائیں کتنی؛
ایک مشکل تو نہیں ہے کہ جو آساں ہو جائے

چاکِ دامن ہی زمانے سے نہیں ہوتا رفو
اور اگر سینہ کبھی چاکِ گریباں ہو جائے

پیچ در پیچ ہے یوں سلسلۂ زلفِ حیات
ہاتھ لگتے ہی جو کچھ اور بھی پیچاں ہو جائے

داغِ دل جلنے لگے بجھ گئی ہر شمعِ طرب

یوں ہے تو یوں ہی سہی گھر میں چراغاں ہو جائے

مجھ پہ قدغن ہے کہ میں بزم میں خاموش رہوں

اور خموشی ہی جو رسوائی کا ساماں ہو جائے

نشترِ شوق کے ہاتھوں گلِ صد برگ ہے دل

خوب ہو اب جو یہ نذرِ رمِ طوفاں ہو جائے

کیوں نہ پھر جلنے لگیں رشک سے ویرانۂ دشت

شہر جب دل کی نگاہوں میں بیاباں ہو جائے

ق

دل کو سودا ہے سے ہے رنگِ شفق پیشِ نظر

غم کو اک طور تو بہلانے کا ساماں ہو جائے

روشنی شام کی سُن پاتے نہ آوازۂ شب

مہرِ زرتاب کا آفاق سے پیماں ہو جائے

بات اس آنکھ میں پوشیدہ ہے وہ عرشؔ کہ جو،

لب سے نکلے تو مرے سینے میں پیکاں ہو جائے

(امروز پرنٹنگ پریس ملتان)

عرش صدیقی

ایک منفرد شاعر ہی نہیں، صاحب طرز افسانہ نگار بھی ہیں

عرش صدیقی کی اُن کہانیوں کا مجموعہ ہے، جن کے مطالعہ کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ایک شیریں اور کومل نظمیں لکھنے والا فنکار ایسے تلخ اور سنگین حقائق سے لبریز افسانے بھی تحریر کرنے پر قادر ہے۔ جن سے آنکھیں ملانے سے گریز تو کیا جا سکتا ہے، مگر جن کے وجود سے انکار ممکن نہیں !

(زیر طبع)